علامہ اقبال، قائداعظم اور نظریۂ پاکستان

اور

اس نظریے سے انحراف کے نتائج

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا ۱۸ فروری ۲۰۰۷ء کا خطاب

بمقام: کنونشن سنٹر، اسلام آباد

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَاذۡکُرُوۡۤا اِذۡ اَنۡتُمۡ قَلِیۡلٌ مُّسۡتَضۡعَفُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ تَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّتَخَطَّفَکُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىکُمۡ وَاَیَّدَکُمۡ بِنَصۡرِہٖ وَرَزَقَکُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ (الانفال)

﴿...... قَالَ عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّہۡلِکَ عَدُوَّکُمۡ وَیَسۡتَخۡلِفَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۹﴾﴾ (الاعراف)

ہمارے ہاں ایک طویل عرصے سے ’’نظریۂ پاکستان‘‘ کے حوالے سے ایک تضاد (controversy) پیدا کر دیا گیا ہے کہ ’’نظریۂ پاکستان‘‘ فی الواقع کوئی شے تھی بھی یا نہیں، کیا اسے ایسے ہی گھڑ لیا گیا ہے یا اس کی کوئی حقیقت ہے؟ دراصل جب کسی بات کے بارے میں خلط مبحث پیدا ہو جائے تو وہ بات چاہے کتنی ہی یقینی ہو اُس پر یقین میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ٹھنڈے دل سے غور وفکر کے ساتھ تجزیہ کیا جائے کہ پاکستان کی بنیادوں میں نظریۂ پاکستان نام کی کوئی شے تھی بھی یا نہیں، اور اگر تھی تو وہ نظریہ کیا تھا؟ اور خاص طور پر یہ کہ اس نظریہ کا خالق کون تھا؟ اس لیے کہ ابھی پچھلے دنوں اخبارات میں ایم کیو ایم کے لیڈر الطاف حسین صاحب نے خاص طور پر یہ بیان دیا کہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ علامہ محمد اقبال نظریۂ پاکستان کے خالق ہیں وہ بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

نظریۂ پاکستان کا تاریخی پس منظر

اس حوالے سے آج ہم اس مسئلے کو ذرا اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اس کے لیے ہمیں تاریخ کا جائزہ لینا ہوگا، اور خاص طور پر یہ کہ ہندوستان میں انگریزوں کے آنے کے بعد مسلم انڈیا کن مسائل سے دوچار ہو گیا تھا۔ انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے آیا تھا، لیکن اٹھارہویں صدی کے وسط میں اُس نے یہاں کی حکومت پر قبضہ کرنے کے عمل کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت رہی۔ بعض علاقوں اور خاص طور پر موجودہ پاکستانی علاقوں پر تو تقریباً آٹھ سو برس سے مسلمانوں کی حکومت چلی آ رہی تھی، جبکہ پورے ہندوستان پر بھی تقریباً چار سو برس تک مسلمانوں نے حکومت کی ہے۔ یعنی انگریزوں کی ہندوستان آمد سے قبل ہندوستان پر مسلمانوں کا غلبہ تھا اور مسلمان حاکم تھے، جبکہ یہاں کے دوسرے ابنائے وطن محکوم تھے۔ لیکن عین اُس وقت جبکہ انگریز آ رہا تھا، صورت حال کچھ بدل چکی تھی اور مرکزی حکومت یا بالفاظِ دیگر مغلیہ حکومت انتہائی کمزور ہو چکی تھی۔ حضرت اورنگزیب عالمگیر کے انتقال کے بعد سے جو زوال کا عمل شروع ہوا ہے تو تقریباً سو برس میں وہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اور ایک وقت تو وہ بھی آیا کہ محاورے کے طور پر یہ کہا جانے لگا کہ ’’حکومت شاہ عالم از لال قلعہ تا پالم‘‘۔ پالم دہلی سے چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا جہاں پھر پالم ایئرپورٹ کے نام سے ہوائی اڈہ بنا۔ تو گویا شاہ عالم کی حکومت لال قلعے سے صرف پالم تک تھی اور بقیہ پورے ہندوستان میں طوائف الملوکی تھی۔ شمالی ہند میں سکھا شاہی تھی، وسطی ہند میں مرہٹوں کی دہشت گردی چل رہی تھی۔ پورا ہندوستان ریاستوں میں منقسم تھا۔ ان میں مسلمان ریاستیں بھی تھیں اور ہندو ریاستیں بھی تھیں۔

اس سب کے باوجود انگریز کی آمد کے وقت بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا پلڑا بھاری

تھا۔لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر کے فرو ہو جانے کے بعد اور ہندوستان کے براہِ راست تاجِ برطانیہ کے تحت آ جانے کے بعد ایک بڑا بنیادی فرق واقع ہوا۔اس سے پہلے چونکہ شمشیر و سناں کا معاملہ چل رہا تھا تو گئے گزرے حالات میں بھی مسلمان کا پلڑا بھاری تھا۔لیکن چونکہ تاج برطانیہ کے تحت حکومت شروع ہوئی قلم کے ذریعے سے (rule of law)، جیسے ایک وائسرائے کا قول ہے:

"Will you be governed by sword or by pen?"

تو نتیجے کے طور پر صورتِ حال یہ پیدا ہوئی کہ اب تلوار تو نیام میں چلی گئی اور صرف تعداد کا معاملہ رہ گیا۔ لہٰذا ہندوؤں کی عددی اکثریت کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہو گئے اور مسلمانوں میں ایک خفیف سا خوف پیدا ہونا شروع ہوا کہ جن پر ہم نے تقریباً آٹھ سو برس حکومت کی ہے اب یہ ہم سے انتقام لیں گے۔

اس سب پر مستزاد ایک بڑا عجیب مظہر (phenomenon) سامنے آیا، جس پر میں چاہتا ہوں کہ آپ توجہ سے غور فرمائیں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف مسلمانوں اور ہندوؤں کے ردّعمل میں فرق تھا۔ ہندوؤں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ پہلے بھی غلام تھے اور اب بھی غلام ہو گئے، ان کے لیے کوئی نیا معاملہ نہیں تھا، بس آقاؤں کی تبدیلی کا معاملہ تھا کہ پہلے حاکم مسلمان تھے اور اب حاکم انگریز تھے۔ وہ تو پہلے بھی محکوم تھے اور اب بھی محکوم ہو گئے۔لہٰذا اُن کے لیے کسی نفسیاتی صدمے اور رنج وغم کی بات نہیں تھی۔لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ صدمے اور غم کا معاملہ تھا۔اس لیے کہ وہ ابھی ابھی تختِ حکومت سے اتارے گئے تھے اور انہیں اپنی سابقہ کیفیت یاد تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر بغاوت کے جراثیم پیدا ہوئے۔انگریز ابھی بنگال سے آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ سید احمد شہید بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی عظیم تحریک ''تحریک شہیدین'' شروع ہوئی۔ ان کے پیشِ نظر یہ تھا کہ پہلے شمالی ہند کو سکھا شاہی سے نجات دلائی جائے، اور پھر چونکہ یہ علاقہ عالمِ اسلام کے ساتھ مسلسل اور متصل ہوگا تو ادھر سے آ کر پھر ہندوستان کو ازسرِنو ہندوؤں کے غلبے سے بھی اور انگریزوں کے غلبے سے بھی نجات دلائی جائے اور دار الاسلام کا جو سٹیٹس چلا آ رہا تھا اسے دوبارہ قائم کیا جائے۔ اگرچہ یہ تحریک بظاہر ۱۸۳۱ء میں شہادت گہِ بالاکوٹ میں ختم ہوگئی، لیکن اس کے باقیات الصالحات تقریباً ایک صدی تک چلتے رہے۔ چنانچہ بہت سے علماء نے پھانسیوں کی سزائیں پائیں۔ مولانا جعفر تھانیسری جیسے بہت سے لوگ پھانسی دیے گئے یا کالا پانی بھیجے گئے۔ بے شمار لوگوں نے قید و بند کی سزائیں بھی برداشت کیں۔اس کے علاوہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ابھی تک تحریک مجاہدین کے جو جہادی اثرات باقی تھے انہوں نے ایک عرصے تک انگریزوں کے ناک میں دم کیے رکھا۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے ہاتھوں سب سے آخر میں جو صوبہ فتح ہوا وہ سندھ تھا اور سندھی مسلمانوں نے انگریز کی اس حکومت کو ذہناً تسلیم نہیں کیا، لہٰذا وہاں ''حر تحریک'' نام سے ایک بہت بڑی تحریک شروع ہوئی۔ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں اخبارات میں اس طرح کی خبریں پڑھنے کو ملتی تھیں کہ آج حروں نے فلاں ریلوے اسٹیشن کو آگ لگا دی ہے اور آج فلاں تھانے کو جلا دیا ہے۔ موجودہ پیر پگاڑا صاحب کے والد صاحب کو انگریز نے پھانسی دے دی اور پھر اُن کی لاش تک نہیں دی، بلکہ ان کی قبر کا بھی کہیں نشان تک نہیں۔اور اِن دونوں بھائیوں کو وہ انگلستان لے گئے تاکہ ان کی برین واشنگ کی جائے اور وہاں کی تہذیب وتمدن کا ان کے اوپر رنگ چڑھایا جائے۔ بہرحال یہ کیفیات تھیں جن کی وجہ سے انگریز کو مسلمانوں سے خوف اور اندیشہ تھا کہ کہیں یہ اپنی کھوئی ہوئی حکومت واپس حاصل کرنے کے لیے بڑے سے بڑا اقدام نہ اٹھا دیں۔

بیسویں صدی کے آغاز تک ہمیں علماء کی ان تحریکوں کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ مثلاً بیسویں صدی کے آغاز میں ریشمی رومال کی تحریک ایک عظیم تحریک تھی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے ایک طرف اپنے نائب مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو افغانستان بھیجا تھا کہ وہ افغانستان کی حکومت کو آمادہ کریں کہ وہ ہندوستان پر حملہ آور ہو۔ دوسری طرف آپ خود حجاز مقدس تشریف لے گئے تھے۔ اُس وقت تک خلافت قائم تھی اور مدینے میں ترک گورنر موجود تھا۔ آپ چاہتے تھے کہ دار الخلافہ تک رسائی حاصل ہو سکے، وہاں سے ہندوستان پر

حملہ ہو اور ہم اندر سے بغاوت کر کے انگریز کو ختم کریں' لیکن یہ راز فاش ہو گیا اور پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ حضرت شیخ الہند کو مکے سے گرفتار کر لیا گیا اور چار سال تک مالٹا کی اسیری میں رکھا گیا' اندازہ کیجیے کہ ایک ہندی مسلمان کو ہندوستان لا کر جیل میں نہیں رکھا گیا' صرف اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں ان کے زیر اثر مسلمانوں کی طرف سے ہنگامہ آرائی نہ ہو جائے۔ جیسے علامہ اقبال کا شعر ہے: ؎

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!

تو حضرت شیخ الہند کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا کہ ان کے نفس تیز سے جو گرمی پیدا ہو رہی تھی اس کے پیش نظر انگریز نے انہیں ہندوستان کے بجائے چار سال تک مالٹا میں اسیر رکھا اور اُس وقت چھوڑا جبکہ ان کی ٹی بی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور انہیں اندیشہ تھا کہ اگر ہماری اسیری کے دوران میں ان کا انتقال ہو گیا تو اس پر کوئی بہت بڑا ردِّعمل پیدا ہو سکتا ہے۔

بہر حال ایک تو یہ عامل تھا جس کی بنا پر انگریز ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا اور انہیں اپنے سے قریب لا رہا تھا' جبکہ مسلمانوں سے کشیدہ تھا اور انہیں دور رکھ رہا تھا۔ اس کا ایک دوسرا فیکٹر بھی تھا۔ ہندوؤں کا اپنی تہذیب اور اپنے فکر و فلسفہ سے تعلق بڑا پرانا ہو چکا تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں سرکاری ملازمتوں کے حصول کے لیے ہندوؤں کو بھی فارسی پڑھنی پڑتی تھی' جیسے انگریزی دَور میں مسلمانوں کو انگریزی پڑھنی پڑی۔ فارسی پڑھنے سے ہندوؤں کے اندر اس کے ثقافتی اثرات بھی لازمی طور پر مترتب ہوئے تھے اور وہ اپنی اصل تہذیب و تمدن سے بہت فاصلے پر آ چکے تھے۔ لہٰذا جب انگریز نے ہندوستان میں تہذیبی و ثقافتی انقلاب (cultural revolution) کا آغاز کیا تو ہندوؤں نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ انگریز کا منصوبہ تھا کہ اپنے نظامِ تعلیم کے ذریعے ہندوستان کے رہنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں کے فکر اور سوچ کو بدلا جائے' ان کے ذہن کے اندر تبدیلی لائی جائے۔ لارڈ میکالے جو اُس پورے نظامِ تعلیم کا بانی تھا' نے کہا تھا کہ ہمارے نظامِ تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی اپنی چمڑی کی رنگت کے اعتبار سے تو ہندوستانی رہ جائیں لیکن اپنے ذہن و فکر' تہذیب و ثقافت اور اپنی معاشرت کے اعتبار سے یورپی بن جائیں۔ تو ہندوؤں نے اس تہذیبی و ثقافتی انقلاب کا خیر مقدم کیا اور فوراً انگریزی زبان اور یورپی علوم پڑھنے شروع کر دیے۔ جبکہ اُن کے مقابلے میں مسلمان اس حوالے سے دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ علماء کے ایک بہت مؤثر طبقے نے انگریزی زبان' انگریزی علوم اور انگریزی تہذیب و تمدن کا کلی بائیکاٹ کیا' جس کا بہت بڑا مرکز دیو بند بنا۔

اس سے یہ فرق واقع ہوا کہ ہندو ہر معاملے میں مسلمانوں سے آگے نکلنے لگے۔ ہندو ملازمتوں میں آگے جا رہا تھا' اسے انگریزوں کا تقرب حاصل ہو رہا تھا اور اس کی سرکار دربار میں رسائی ہو رہی تھی' جبکہ مسلمان دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ایک مشہور انگریزی مصنف W.W.Hunter نے اپنی ایک کتاب ''Our Indian Musalmans'' میں لکھا کہ اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو ہندوستان میں مسلمان یا تو منڈیوں کے اندر پلّے دار اور مزدور رہ جائیں گے یا سرکاری دفتروں میں ہوں گے بھی تو محض چپڑاسی یا زیادہ سے زیادہ دفتری ہوں گے' اس کے علاوہ برٹش انڈیا میں ان کا کوئی سٹیٹس نہیں ہو گا۔

اس موقع پر سر سید احمد خان کی عظیم شخصیت منظر عام پر آئی۔ اگرچہ ہمیں ان سے بہت سی باتوں میں اختلاف ہے' مفسر قرآن اور متکلم کی حیثیت سے جو باتیں انہوں نے کی ہیں وہ ہمارے لیے بہت تکلیف دہ ہیں' لیکن ان کے ایک محبّ قوم مسلمان ہونے میں ہمیں کوئی شک نہیں' مسلمانوں کی محبت ان کے دل میں انتہائی زیادہ تھی اور وہ مسلمانوں کے لیے بہت دردمند تھے۔ سر سید احمد خان نے اس معاملے میں دو کام کیے۔ ایک تو بڑی عظیم کتاب لکھی: ''اسبابِ بغاوتِ ہند''۔ اس میں انہوں نے انگریزوں کو بتایا کہ یہاں ہندوستان میں بغاوت کس طرح ہوئی ہے اور اس کے اصل اسباب کیا تھے۔ اور ساتھ ہی مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کو اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ مسلمانوں کو باغی مت سمجھا جائے' یہ بھی پُر امن شہریوں کی حیثیت سے زندگی گزار سکتے ہیں۔

دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ مسلمانوں کو اس بات پر ابھارا کہ وہ انگریزی پڑھیں اور انگریزی علوم حاصل کریں' اور انہیں متنبہ کیا کہ ورنہ ان کا وہی حال ہو جائے گا جو ڈبلیو ڈبلیو

ہنٹر نے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔ لہٰذا وہ انگریزی علوم پڑھیں، انگریزی زبان سیکھیں، نئی سائنس سیکھیں۔ ان چیزوں میں جو غلط ہوں انہیں ردّ کر دیں اور جو صحیح ہوں انہیں اختیار کریں۔ بہرحال مسلمان تو انگریز کے تہذیبی و ثقافتی انقلاب کو قبول کرنے کے اعتبار سے منقسم ہو گئے جبکہ ہندوؤں نے یکسو ہو کر اسے قبول کر لیا۔ لہٰذا انگریزوں نے بھی ان کی زیادہ دلجوئی کی اور انہیں اپنے قریب کیا، جبکہ مسلمانوں کو دُور رکھا۔ اس اعتبار سے اب ہندوؤں کی طاقت کا پلڑا بھاری ہونا شروع ہو گیا اور مسلمانوں میں ایک احساس اور خوف پیدا ہوا کہ ہندو اگر اسی طریقے سے آگے بڑھتے چلے گئے تو یہ ہم سے اپنی آٹھ سو سالہ غلامی کا انتقام لیں گے۔ اس احساس کو میں چاہتا ہوں کہ آپ بالخصوص نوٹ کر لیں۔

ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ کا قیام

اس موقع پر ہندوستان میں دو عظیم سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں، ایک انڈین نیشنل کانگریس اور ایک آل انڈیا مسلم لیگ۔ عجیب بات یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا قائم کرنے والا ایک انگریز مسٹر ہیوم تھا، جو ایک ریٹائرڈ سول سرونٹ تھا۔ اس کے کانوں میں کچھ ایسی خبریں پہنچیں کہ بنگال میں کچھ ہندو اور کچھ مسلمان نوجوان ایک زیرزمین تحریک شروع کرنے والے ہیں جس میں انگریزوں کو یہاں سے نکالنے کے لیے دہشت گردی ہو گی اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اُس نے اس وقت کے وائسرائے لارڈ لٹن سے بات کی اور اسے تجویز پیش کی کہ یہاں ہندوستانیوں کی ایک جماعت ایسی قائم ہونی چاہیے جو دستوری و قانونی طور پر اور پُرامن طریقے سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ لہٰذا اس کے لیے میدان کھول دیا جائے تا کہ اس زیرزمین تحریک اور اس کے نتیجے کے طور پر دہشت گردی کی تحریک کا سدّباب کیا جا سکے۔ پہلے لارڈ لٹن نے اور اس کے بعد لارڈ ڈفرن نے اس کی سرپرستی کی اور ان کی اس محنت کے ذریعے ۱۸۸۵ء میں پونا کے مقام پر آل انڈیا نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے ۲۱ سال بعد ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ وجود میں آئی۔

مسلم لیگ کے قیام کا پس منظر بھی جان لیجیے۔ انگلستان میں لبرل پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور اس کے ہاں، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، انسانی تصورات نسبتاً زیادہ تھے، لہٰذا وہاں بات ہونے لگی کہ ہندوستانیوں کو بھی کچھ حقوق دیے جائیں اور انتظامی و حکومتی معاملات میں ان کو بھی شریک کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے کچھ کونسلیں بنائی جائیں۔ مثلاً وائسرائے اور گورنروں کے ساتھ ایک ایک کونسل ہو، اور یہ کونسلیں حکومت اور عوام کے درمیان ایک پل کا کام دے سکیں۔ اس اعتبار سے مسلمانوں میں شدید تشویش پیدا ہوئی کہ اگر ان کونسلوں میں ''ایک فرد ایک ووٹ'' کے حساب سے نمائندگی کا معاملہ ہوا تو مسلمان تو ہندو سے بہت پیچھے رہ جائے گا، دب جائے گا اور اس کا مستقل غلام ہو جائے گا! یہ تشویش سب سے پہلے سر سید احمد خان کے رفیق کار نواب محسن الملک کے دل میں پیدا ہوئی۔ ان کے ساتھ علی گڑھ ہی کے ایک رئیس حاجی محمد اسماعیل نے مل کر بہت سے مسلمان زعماء سے رابطہ قائم کیا اور پھر سب کے مشورے سے علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپل کے ذریعے جو شملہ میں تھا، شملہ میں ہی موجود وائسرائے لارڈ منٹو سے ملاقات کا وقت لیا۔ چنانچہ ''شملہ وفد'' کے نام سے ایک وفد سر آغا خان کی قیادت میں وائسرائے کے سامنے پیش ہوا اور وہاں پر انہوں نے دو باتیں رکھیں۔ ایک تو یہ کہ وائسرائے کو مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دلایا کہ مسلمانوں سے آپ کوئی اندیشہ اور خطرہ محسوس نہ کریں، ہم آپ کی حکومت کو تسلیم کرتے ہیں اور آپ کی Government by Pen کی پالیسی کے ساتھ پورے طور سے متفق ہیں۔ دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ کونسلوں اور اس طرح کے دیگر اداروں کی نمائندگی میں ''ایک فرد ایک ووٹ'' کے اصول کو اپنایا گیا تو یہ مسلمانوں کے ساتھ بہت زیادہ ناانصافی ہو گی، لہٰذا اس حوالے سے مسلمانوں کا لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ لارڈ منٹو نے اس کا بہت مثبت جواب دیا۔ وی پی منیم کی کتاب ''Transfer of Power in India'' سے اس کا ایک اقتباس پیش ہے:

> ''مجھے آپ ہی کی طرح اس امر کا یقین ہے کہ برصغیر میں انتخاب کے ذریعے زندگی کا ہر وہ طریقہ بری طرح ناکام ہو گا جس میں محض 'ایک فرد ایک ووٹ' کا اصول کارفرما ہو اور برصغیر کی آبادی کی مختلف قومیتوں کے عقائد اور روایات کا خیال نہ رکھا جائے''۔

گویا مسلم وفد کے نقطۂ نظر کو وائسرائے نے قبول کیا۔ اسی سے حوصلہ پا کر نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، سر آغا خان اور دیگر بڑی بڑی شخصیتوں نے دسمبر ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ خان کی محل نما کوٹھی میں اجلاس بلایا اور مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ سر آغا خان صدر اور سرسید کے ساتھی نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک سیکرٹری مقرر ہوئے۔

اقبال اور جناح کی شخصیات کا تقابل

اس قصے کو یہیں چھوڑ کر ذرا آگے چلتے ہیں۔ مسلمانانِ ہند کے اندر دو عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں، جنہیں ہم شریک بانیانِ پاکستان (co-founders) کہہ سکتے ہیں، یعنی علامہ محمد اقبال اور مسٹر محمد علی جناح۔ میری تقریر کے اس حصے میں محمد علی جناح کے لیے لفظ ''قائد اعظم'' استعمال نہیں ہوگا، اس لیے کہ آپ قائد اعظم ایک طویل عرصے کے بعد بنے ہیں۔ علامہ محمد اقبال ایک مفکر، فلسفی، دانشور اور شاعر تھے اور محمد علی جناح بیرسٹر تھے اور ساتھ ہی ایک سیاسی کارکن بھی تھے۔ ان دونوں کی شخصیتوں کے بعض پہلو بہت دلچسپ ہیں۔ دونوں قریبی ہم عصر تھے۔ علامہ محمد اقبال مسٹر جناح سے صرف ساڑھے دس مہینے چھوٹے تھے۔ مسٹر جناح کی پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو اور علامہ محمد اقبال کی پیدائش ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو ہوئی۔ علامہ اقبال کا مقامِ پیدائش سیالکوٹ ہے، جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، جبکہ محمد علی جناح کا مقامِ پیدائش عام طور پر تو کراچی بتایا جاتا ہے لیکن حیدر آباد یونیورسٹی کے ساتھ ملحق انسٹی ٹیوٹ آف سندھالوجی کے محققین کا فیصلہ ہے کہ آپ کی پیدائش ٹھٹھہ کے قریب جھرک کے مقام پر ہوئی۔ خاندانی پس منظر کے اعتبار سے علامہ اقبال بالاتفاق کشمیری پنڈت تھے۔ لیکن محمد علی جناح کے خاندانی پس منظر کے بارے میں اختلاف ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ آپ اسماعیلی خوجے تھے، لیکن مجھے اس بارے میں ایک عجیب اقتباس ملا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں ماہنامہ ''نقوش'' نے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل آپ بیتی نمبر شائع کیا تھا جس میں تمام مشاہیر کی زندگی کے حالات ان کی اپنی تحریروں سے یا اپنے اقوال کے حوالے سے بڑی خوبصورتی سے جمع کیے گئے۔ مسٹر جناح کے بقول آپ اصل میں منٹگمری کے علاقے کے ایک راجپوت خاندان کی نسل سے ہیں۔ مسٹر جناح سے جب نواب صاحب باغ پت نے کہا کہ آپ کا خاندان تو تجارت پیشہ ہے، پھر آپ میں یہ گھن گرج کیسے آئی؟ تو آپ نے کہا: میں اصل میں پنجابی راجپوت ہوں۔ کئی پشتیں گزریں کہ میرے اجداد میں سے ایک صاحب جو منٹگمری (موجودہ ساہیوال) کے رہنے والے تھے، کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک خوجہ لڑکی سے شادی کر لی تھی اور انہی کے خاندان میں مل گئے تھے۔ اس وقت سے ہم لوگ خوجوں میں شمار ہونے لگے۔ لہٰذا میں اسماعیلی خوجہ نہیں ہوں، بلکہ میری رگوں میں جو خون ہے وہ راجپوت کا ہے۔ اس قول کے راوی صغیر احمد عباسی، پرائیویٹ سیکرٹری آف نواب صاحب چھتاری ہیں۔

یہ باتیں تو صرف دلچسپی کی حد تک ہیں، ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ البتہ ایک اور بات جس کی یقیناً اہمیت ہے، وہ یہ کہ علامہ اقبال کے خاندانی اثرات میں مذہبی روح اور مذہبی جذبہ بڑا گہرا تھا۔ ان کے والد شیخ نور محمد صوفی مزاج بزرگ تھے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی سے بڑھ کر ان کا مزاج بہت صوفیانہ تھا۔ آپ کی والدہ بہت نیک خاتون تھیں۔ ابتدائی تعلیم میں علامہ میر کاشمیری کا فیض حاصل ہوا جو بہت بڑے عالم اور بہت بڑے مدرس تھے۔ چنانچہ علامہ اقبال کی ابتدائی تربیت کے اندر مذہب کا حصہ کافی تھا، جبکہ ایسی کوئی چیز محمد علی جناح کے بارے میں ہمارے علم میں نہیں ہے۔ ان کے والد گرامی جناح پونجا ایک عام درجے کے کاروباری تھے اور چمڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ محمد علی جناح ذہانت و فطانت اور محنت و مشقت میں بہت آگے تھے۔ انہوں نے میٹرک تو سولہ سال کی عمر میں پاس کیا، لیکن ذرا غور کیجیے کہ پھر صرف بیس سال کی عمر میں انگلستان سے بیرسٹری کر کے واپس آ گئے۔ واپس آتے ہی کراچی میں پریکٹس شروع کی، لیکن کراچی میں پریکٹس نہیں چل سکی، لہٰذا بمبئی چلے گئے جہاں پر پریکٹس جم گئی اور آپ آگے سے آگے بڑھتے چلے گئے۔

محمد علی جناح کی ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوششیں اور ان کا انجام

محمد علی جناح کا مزاج بنیادی طور پر سیکولر اور قوم پرستانہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں جب

مسلم لیگ قائم ہوئی تو اس میں شامل نہیں ہوئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اس کا نصب العین بلند اور مقصد اعلیٰ نہیں ہے، یہ صرف ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ نمائندگی کے حصول کے لیے اور انگریز کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے قائم ہوئی ہے۔ مسلم لیگ کے بجائے آپ کانگریس میں تھے اور کانگریس کے صدر دادا بھائی نوروجی کے سیکرٹری تھے۔ مسلم لیگ کے قیام کے سات برس بعد ۱۹۱۳ء میں جب مسلم لیگ نے بھی خود اختیاری کے حصول کو اپنا نصب العین بنا لیا تب مولانا محمد علی جوہر کے بہت زیادہ اصرار پر مسلم لیگ میں شامل ہوئے۔ اس کے بعد بھی ۱۹۲۰ء تک انہوں نے دوہری رکنیت اختیار کیے رکھی، کانگریس کی بھی اور مسلم لیگ کی بھی۔ اور اس پورے عرصے میں ان کی کوشش یہی تھی کہ کسی طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت ہو جائے اور کوئی ایسا فارمولا طے ہو جائے جو فریقین کے لیے قابل قبول ہو، جس سے مسلمانوں کی تشویش ختم ہو اور انہیں اطمینان حاصل ہو کہ ہمارا مستقبل خطرے میں نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے سرتوڑ کوشش اور جاں گسل محنت کی اور ان خدمات کے طفیل میں انہیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا گیا۔ اور یہ کہنے والا بھی گوکھلے تھا۔ لیکن اس قدر محنت کے باوجود انہیں قدم قدم پر مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ چونکہ ۱۹۲۰ء تک ان کے پاس کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کی ممبر شپ تھی لہٰذا انہوں نے کوشش کی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کا اجلاس ایک ہی مقام پر ہو، تاکہ طرفین کے لیڈروں کا آپس میں میل جول ہو سکے اور باہم گفت و شنید سے اس مقصد کی طرف پیش رفت ہو سکے۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں بمبئی میں اور ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں اجلاس ہوئے۔ لکھنؤ کے اجلاس میں پہلی مرتبہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے مطالبے کو تسلیم کر لیا کہ انتخابات جداگانہ اصول پر ہوں گے اور مسلمانوں کو اُن کی آبادی کی تعداد کی نسبت سے سیٹیں ملیں گی۔

یہ محمد علی جناح کی بہت بڑی کامیابی تھی، لیکن اس کے پس منظر میں ایک اور چیز بڑی اہم تھی۔ ۱۹-۱۹۱۸ء سے ہندوستان میں ایک عظیم تحریک ''تحریک خلافت'' شروع ہو چکی تھی، اس لیے کہ خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کے لیے عالمی سطح پر بڑی سازشیں چل رہی تھیں اور یہودی سرگرم تھے کہ برطانیہ کے ذریعے سے خلافت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اُس وقت ہندو اور مسلمان ایک ہو گئے تھے اور گاندھی جی بھی خلافت کی تحریک میں شامل ہوئے تھے، حالانکہ گاندھی اور خلافت کا باہم رشتہ ہی کیا تھا! لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ اس وقت مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیے، اس لیے کہ اس تحریک کا ترانہ پورے ہندوستان میں گونج رہا تھا: ؎

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو!
ساتھ ہیں تیرے شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو!!

یہ یقیناً ایک عظیم تحریک تھی اور اسی کے پس منظر میں مَیں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ پیکٹ ہوا اور قائداعظم کو اس میں اپنی کامیابی کی صورت نظر آئی۔ لیکن ۱۹۲۴ء میں مصطفیٰ کمال پاشا نے خود ہی خلافت کا خاتمہ کر دیا، بقول علامہ اقبال: ؎

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی اپنوں کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ!

خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہی تحریک خلافت کا سارا جوش و خروش ختم ہو گیا اور صورتِ حال یکسر تبدیل ہو گئی۔ اب ہندوؤں کے اندر اپنی عصبیت اور مسلمانوں کی مخالفت کے جذبات ابھر کر سامنے آ گئے۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ شائع ہوئی جس نے مسلمانوں کی ہندوؤں سے تمام امیدوں کا قلع قمع کر دیا اور ان پر واضح ہو گیا کہ ہندو کسی درجے میں بھی مسلمانوں کو کوئی حیثیت دینے کو تیار نہیں۔ یہ نہرو رپورٹ گویا ایک اہم موڑ (turning point) ثابت ہوئی۔ اس کے بعد محمد علی جناح صاحب نے ایک کوشش اور کی اور ''تجاویز دہلی'' کے نام سے ایک خاکہ پیش کیا، لیکن وہ تجاویز بھی ردّ کر دی گئیں۔ پھر انہوں نے ''چودہ نکات'' پیش کیے تو وہ بھی ردّ کر دیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انتہائی مایوس، دل گرفتہ اور دل شکستہ ہو کر محمد علی جناح نے ہندوستان کو خیرباد کہہ دیا اور ان کی زندگی کا ایک دَور یہاں ختم ہو گیا۔ محمد علی جناح ۱۹۳۱ء میں انگلستان منتقل ہوئے، وہاں ایک کوٹھی خرید لی، اپنی لیگل پریکٹس شروع کر دی اور ہندوستان کی سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی۔

علامہ اقبال اور وطنی قومیت

اب ذرا دوسری شخصیت کی طرف آئیے جو مسلمانانِ ہند میں سے ابھر کر سامنے آئی۔ یہ علامہ محمد اقبال تھے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا' ان کی ابتدائی تعلیم اور خاندانی پس منظر کے اندر مذہبی اثرات بڑے گہرے تھے۔ لیکن ۱۸۹۹ء میں ایم اے کرنے کے بعد سے لے کر ۱۹۰۵ء تک کا اقبال اور تھا۔ اس دَور میں ایک طرف تو وہ ہندی نیشنلزم کے خوگر نظر آتے ہیں اور دوسری طرف ان کی شاعری میں گل و بلبل کے افسانے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ''ترانۂ ہندی'' ان کا اُسی دَور کا ترانہ ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا!

آج بھی یہ ترانہ ہندوستان حکومت کی سرپرستی میں ریڈیو پر نشر کیا جاتا ہے۔ بلکہ اُس زمانے میں انہوں نے اپنی ایک نظم ''نیا شوالہ'' میں ایک شعر ایسا بھی لکھا جس کی ان کے بعد کے اشعار میں شدید ترین نفی ہوتی ہے:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے!

اس درجے گہری ہندی قوم پرستی اقبال کے اندر بھی موجود تھی۔ لیکن آپ ۱۹۰۵ء میں ۲۸ سال کی عمر میں انگلستان چلے گئے اور تین سال تک انگلستان اور جرمنی میں رہے۔ اس دوران انہوں نے بیرسٹری کی۔ چونکہ فلسفی تھے اور پی ایچ ڈی بھی کر چکے تھے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں اقبال کی قلب ماہیت ہو گئی۔

یہ بات میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ میں پہلی مرتبہ ۱۹۷۰ء میں انگلستان گیا جبکہ میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابصار احمد وہاں زیر تعلیم تھے تو میں نے مشاہدہ کیا کہ وہاں یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے اور ایک ایک دو دو پی ایچ ڈیز کیے ہوئے لوگ جمعہ کے روز اکٹھے ہوتے ہیں' قرآن پڑھتے ہیں' درسِ قرآن کی محافل ہوتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو قرآن مجید پڑھ کر سناتے ہیں تاکہ تجوید کی غلطیوں کی اصلاح ہو سکے' جبکہ پاکستان میں میرے مشاہدے میں اس طرح کی بات نہیں آئی کہ یہاں اس سطح کے لوگ اس قسم کی مصروفیات میں مشغول ہوں۔ چنانچہ میرا تجزیہ یہ تھا کہ جن لوگوں کی بنیادی تربیت اور خاندانی اثرات میں مذہب کا عنصر موجود ہوتا ہے تو چاہے اپنے ملک میں رہتے ہوئے اس کے آثار زیادہ ظاہر اور نمایاں ہو کر سامنے نہ آئیں' لیکن جب وہ ایک مخالف ماحول میں پہنچتے ہیں تو اس ماحول میں ان کے اندر کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑکتی ہے۔ امریکہ میں بھی میں نے یہی کچھ دیکھا ہے کہ یہی دو نتیجے نکلتے ہیں کہ جو لوگ وہاں جاتے ہیں اُن میں سے کچھ لوگ تو سیلاب کی رو میں بہہ جاتے ہیں' وہاں کی تہذیب میں رنگے جاتے ہیں اور شراب و شباب اور رقص و سرود وغیرہ ساری چیزیں ان کی زندگیوں میں شامل ہو جاتی ہیں' لیکن کچھ دوسرے لوگ جن میں دین کی حمیت کی کچھ چنگاری موجود ہوتی ہے وہ پھر دین کے معاملے میں فعال ہو جاتے ہیں اور وہ چنگاری ایک شعلہ بن کر بھڑک اٹھتی ہے۔ علامہ اقبال کے ساتھ بھی بعینہٖ یہی معاملہ پیش آیا۔ علامہ اقبال خود کہتے ہیں: ع ''مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے''۔ چنانچہ وہاں سے واپس آنے کے بعد ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۰ء تک پورے ۲۲ برس علامہ اقبال نے یہی کچھ کیا کہ اسلام کے نظامِ فکر' فلسفہ اور حکمت کو اپنی شاعری اور نثر کے ذریعے بیان کیا اور قرآن کی ایک نہایت جدید اور بہت عمدہ تفسیر پیش کی۔ اگرچہ یہ تفسیر آپ کو ''تفسیرِ اقبال'' کے نام سے نہیں ملے گی' لیکن کلامِ اقبال خود تفسیرِ قرآن ہے۔ اقبال دعویٰ کرتا ہے کہ میرے پیغام میں سوائے قرآن کے اور کچھ نہیں ہے۔ اقبال سرورِ کائنات ﷺ کے حضور مناجات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا!
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا!

''اے اللہ کے رسولؐ! اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو، اور اگر میری شاعری میں قرآن کے سوا کسی اور چیز کی ترجمانی ہے تو آپ میرے فکر کا پردہ چاک کر دیجیے اور اس چمن کو مجھ جیسے کانٹے سے پاک کر دیجیے۔ مزید برآں قیامت کے دن مجھے ذلیل وخوار کیجیے گا اور مجھے اپنی قدم بوسی سے محروم کر دیجیے گا!''

یہ اقبال کا دعویٰ ہے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے قرآن سے کہا ہے۔

مجھے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا جو تھوڑا بہت فہم اور فکر دیا ہے اس کے ذرائع (sources) میں آٹھ اشخاص بہت نمایاں ہیں۔ ان میں سے دو ''اَبوین'' ہیں، یعنی ابوالاعلیٰ مودودی اور ابوالکلام آزاد۔ دو ''دکتورَین'' ہیں، یعنی ڈاکٹر محمد اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین۔ دو ''شیخین'' ہیں، یعنی شیخ الہند مولانا محمود حسن اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی۔ قرآن فہمی میں مَیں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن کا ترجمۂ قرآن مجید بہت مفید پایا ہے، جس پر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے حواشی ہیں۔ ان کے علاوہ دو ''حی این'' ہیں، یعنی مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی، جنہوں نے قرآن مجید کے مضامین کے اندر موجود نظم کو واضح کیا ہے۔ اس طرح علامہ اقبال بھی میرے لیے قرآن مجید کے فہم اور فکر کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ بلکہ بچپن میں ہی مجھ پر علامہ اقبال کا بہت زیادہ گہرا اثر ہے۔ میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا جب ان کی نظم ''جوابِ شکوہ'' کا یہ شعر میرے ذہن میں چپک کر رہ گیا: ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

علامہ اقبال نے مغربی فکر پر شدید تنقید کی اور خاص طور پر مغربی تہذیب کی نفی کی۔ اس سب سے بڑھ کر وہ تجدیدِ ملت اسلامی اور احیائے فکر اسلامی کے علمبردار بن کر سامنے آئے۔ سب جانتے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ملت اسلامیہ کی کیا حالت ہو گئی تھی! سلطنتِ عثمانیہ کی دھجیاں بکھر گئیں۔ نوآبادیاتی استعمار پورے عالم اسلام پر حکمران تھا اور عالمِ اسلام محکوم تھا۔ اقبال نے خوشخبری دی کہ اگرچہ اس وقت ملت اسلامیہ پسی اور دبی ہوئی ہے، لیکن اس کا دوبارہ غلبہ ہو گا، ملت اسلامیہ کی تجدید ہو گی، اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہو گی۔ اس طرح اقبال اسلام کے روشن مستقبل کے مبشر بن کر سامنے آئے۔ اقبال نے ایک اور بہت بڑا کام جو کیا وہ ان کی طرف سے وطنی قومیت کی شدید ترین نفی ہے۔ اس لیے کہ اُس وقت وطنی قومیت مسلمانوں کو اپنے اندر ہڑپ کرنے کے لیے پوری قوت کے ساتھ زور لگا رہی تھی۔ ہندوؤں میں اُس دور میں مذہبی تجدید کا عمل بڑی شدت کے ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ بنکم چیٹر جی ہندو احیاء کا بہت بڑا علم بردار تھا۔ اس نے ''بندے ماترم'' کا ترانہ پیش کیا جس میں زمین کی بندگی کا تصور ہے کہ بھارت ماتا! ہم تیرے بندے ہیں۔ بھارت میں آج بھی مسلمانوں کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ بھی سکولوں کے اندر یہ ترانہ پڑھیں اور مسلمان ابھی تک اس کے خلاف مزاحمت کر رہے ہیں۔

اس حوالے سے پھر دوسری شخصیت راجہ رام موہن رائے کی سامنے آئی۔ یہ شخص بہت بڑا عالم وفاضل اور دس کے قریب زبانوں کا ماہر تھا، جن میں مغربی زبانیں بھی تھیں اور مشرقی بھی۔ انگریز پادریوں نے جب یہاں پر تثلیث کی تلقین شروع کی تو یہ شخص مسلمانوں کا ہمدرد بن کر سامنے آیا اور تثلیث کی نفی کے لیے ''آئینۂ توحید'' کے نام سے کتابچہ لکھا۔ یہ کچھ ایسی شخصیت بننے کی کوشش کر رہا تھا کہ مسلمان بھی اس کو قبول کریں۔ اس کے بعد پھر اس نے ''برہمو سماج'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، اور وہی فلسفہ پیش کیا جو اس سے پہلے اکبر بادشاہ نے ''دینِ الٰہی'' کے نام سے پیش کیا تھا کہ اللہ کو تو سب مانتے ہیں، بس اس کے نام مختلف ہیں، کسی نے اس کا نام مہادیو رکھ دیا، کسی نے اللہ اور کسی نے God۔ جبکہ شریعت اور رسالت (نعوذ باللہ) فساد کی جڑ ہے، رسالت کی بنیاد پر شریعتیں مختلف ہو جاتی ہیں، عبادتیں مختلف ہو جاتی ہیں، لہٰذا اس کو پس پشت ڈالو۔ دینِ الٰہی یا بالفاظِ دیگر دینِ اکبری میں درحقیقت کوشش یہ تھی کہ تمام مذاہب کو ایک ہاون دستے میں کوٹ کر، چھان پیس کر اور

ایک سفوف بنا کر پورے ہندوستان کا ایک ہی مشترک مذہب وجود میں لایا جائے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو کھڑا کیا جنہوں نے اس فتنے کی سرکوبی کی۔ رام موہن رائے نے بھی ''مجلسِ ایزدی'' کے نام سے اسی قسم کے ایک ادارے کی داغ بیل ڈالی۔ یہ فلسفہ مسلمانوں کے حق میں میٹھی چھری کی مانند تھا۔ اس لیے کہ اسلام اور شریعت کا سارا دارومدار تو رسالت اور نبوت پر ہے۔ بقول اقبال:

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است!

اگر قرآن کو حدیث وسنت اور رسالت سے کاٹ دیجیے تو پھر تو اسے موم کی ناک بنا کر جدھر چاہیں موڑ لیں، اس کی جو بھی تعبیر اور تشریح چاہیں کر لیں۔

اس سلسلے کی تیسری تحریک دیانند سرسوتی کی ''آریہ سماج'' تحریک تھی۔ یہ بہت پُرتشدد اور جارحیت پسند (militant) تحریک تھی اور ہندو معاشرے میں اس کو بہت پذیرائی ملی۔ انہوں نے کھل کر یہ کہا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک ہے، یہاں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں، لہٰذا مسلمان یا ہندو ہو جائیں یا پھر یہاں سے ہجرت کر جائیں۔ اس آریہ سماج کے تحت پھر آر ایس ایس بنی جو ہندوؤں کی انتہائی جارحیت پسند تنظیم تھی۔ اسی طرح پھر شدھی کی تحریک شروع ہوئی کہ مسلمانوں کو دوبارہ ہندو بنایا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کے آباء واجداد ہم ہی میں سے تھے جو مسلمان ہو گئے تھے، لہٰذا انہیں واپس لایا جائے۔ چنانچہ راجستھان کے علاقے میں یہ تحریک بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی، جہاں مسلمانوں میں جہالت تھی، علم نہیں تھا۔ بس کسی صوفی اور بزرگ کے فیض سے وہ لوگ مسلمان تو ہو گئے تھے مگر ان کی تربیت کا کوئی انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ مسلمان حکومتوں نے تو اسلام کی تبلیغ واشاعت اور مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام سرے سے کیا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح میوات کے علاقے میں میو مسلمان بڑی تیزی کے ساتھ ہندو ہو رہے تھے۔ اسی شدھی کی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے مولانا الیاسؒ نے تبلیغی جماعت کا نظام بنایا کہ بس چھ باتیں لے کر دیہاتوں میں جاؤ اور تبلیغ کرو، کوئی تنخواہ نہیں ہو گی اور کھانے پینے کا انتظام بھی اپنا ہی کرنا ہو گا۔ پھر سنگھٹن کی تحریک شروع ہوئی کہ سب ہندوؤں کو جمع کر دیا جائے۔ ان حالات میں اقبال نے وطنیت کی شدید ترین نفی کی۔ ان کی نظم ''وطنیت'' ملاحظہ کیجیے:

اِس دَور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دین نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے!

قلبِ ماہیت کا ذرا اندازہ کیجیے کہ وہی شخص جو کل کہہ رہا تھا کہ ع ''خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!'' وہ آج اس وطن کو سب سے بڑا بت قرار دے کر اس کو پاش پاش کرنے کے لیے کس قدر رزم ور دار الفاظ استعمال کر رہا ہے۔ قومی ریاست (Nation State) کا تصور اٹھارہویں صدی سے یورپ میں شروع ہوا کہ ایک ملک میں رہنے والے سب شہری برابر ہیں اور اُن کے اندر مذہب کا اختلاف کوئی حیثیت نہیں رکھتا، مذہب تو ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے، سرکاری سطح کے اور اجتماعی معاملات کسی مذہب کے مطابق طے نہیں ہوں گے۔ اس ضمن میں ان کا ایک قطعہ اس سے بھی بڑھ کر ہے:

منزلِ رہرواں دور بھی، دشوار بھی ہے

کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے؟
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس سلسلے میں وہ کردار ادا کیا جو دین اکبری کا قلع قمع کرنے میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے ادا کیا تھا۔ اس اعتبار سے میں کہا کرتا ہوں کہ علامہ محمد اقبال حضرت مجدد الف ثانی کے بروز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کو حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ گہری نسبت تھی۔ فرماتے ہیں: ؎

حاضر ہوا میں شیخ مجددؒ کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اِس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے
اِس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اَسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمئ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

اقبال نے ان کو ''سرمایۂ ملت کا نگہبان'' کہا ہے اور سرمایۂ ملت کا تمام تر دارو مدار ایمان بالرسالت پر ہے۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب میں سب سے زیادہ زور اطاعت رسول پر ہے۔ اکبر نے دین الٰہی کے ذریعے سے اطاعت رسول کی جڑ کاٹنے کی کوشش کی تھی لیکن مجدد الف ثانیؒ نے اُس کو دوبارہ مستحکم کیا ہے۔

علامہ اقبال اور تصورِ پاکستان

صفحات گزشتہ میں ہم یہ اہم بات دیکھ آئے ہیں کہ محمد علی جناح دسمبر ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کی سیاست سے مایوس ہو کر ملک چھوڑ کر انگلستان میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ آپ کے علم میں لانا چاہتا ہوں۔ شیخ محمد اکرام کا نام آپ حضرات کے علم میں ہوگا' ان کی تین کتابیں آبِ کوثر' موجِ کوثر اور رودِ کوثر بڑی معرکۃ الآراء کتابیں ہیں۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے بہت عرصے تک ڈائریکٹر رہے۔ بہت پڑھے لکھے آدمی تھے اور اُس زمانے میں آکسفورڈ میں پڑھتے تھے۔ وہ لندن گئے تو انہوں نے وہاں محمد علی جناح سے ملاقات کی اور دریافت کیا کہ آپ ہندوستان کیوں چھوڑ کر آ گئے؟ ہندوستان کے مسلمانوں کو تو آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ محمد علی جناح کا جواب نوٹ کرنے کے قابل ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہندو نا قابل اصلاح ہیں اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ان کا ایک لیڈر مجھ سے جو بات صبح کو کرتا ہے وہ شام کو ڈپٹی کمشنر کو بتا دیتا ہے۔ تو اب میں ایسی قوم کی راہنمائی کیسے کروں؟ جناح صاحب کی مایوسی کا یہ عالم ہے اور انہوں نے یہ نتیجہ اپنی چوبیس برس کی محنت شاقہ کے بعد نکالا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۹۳۰ء اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس سال مسلم انڈیا کا ایک سورج تو غروب ہو رہا تھا اور مغرب میں جا کر بیٹھ گیا تھا (سورج مغرب ہی میں غروب ہوتا ہے) لیکن اسی سال مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر علامہ محمد اقبال کے نام سے ایک سورج طلوع ہوا۔ ان کا ۱۹۳۰ء کا خطبۂ الٰہ آباد بہت اہم ہے۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے وطنیت کی جو نفی کی تھی اور مسلم قومیت کا جو اثبات کیا تھا اسے فلسفیانہ انداز میں عمرانیات (Sociology) کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں جس انداز سے مدلل طور پر بیان کیا ہے' اس اعتبار سے وہ ایک بہت قیمتی دستاویز ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک تجویز پیش کی۔ یہ گویا ایک پیشین گوئی تھی کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک مسلمان ریاست قائم ہوگی۔ علامہ اقبال کے الفاظ تھے:

"I would like to see the Punjab, the North-West Frontier Province, Sindh and Baluchistan amalgamated into a single state. Self-government within the British Empire or without the British Empire, the formation of a consolidated North West-Indian Muslim State appears to me to be the final destiny of the Muslims, at least of North-West India."

''میں پنجاب' سرحد' سندھ اور بلوچستان کو متحد ہو کر ایک واحد ریاست کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں' جس کی اپنی حکومت ہو خواہ سلطنت برطانیہ کے تحت یا اس سے الگ۔ اور مجھے نظر آ رہا ہے کہ یہ متحدہ شمال مغربی مسلم ریاست کم از کم شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے تقدیرِ مبرم ہے''۔

اس ضمن میں اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ علامہ اقبال نے تو ہندوستان کے اندر برطانیہ کی حکومت کے تحت ایک ریاست کی تجویز دی تھی' لیکن یہ بات غلط ہے۔ اصل میں نوٹ کیجیے کہ ۱۹۳۰ء تک تو اس کا کوئی امکان ہی نظر نہیں آتا تھا کہ انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلا جائے گا۔ تو اُس وقت کے لیے ان کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان میں ایک صوبہ بنا دیا جائے' جیسے آج کا پاکستان ہے یا کچھ عرصہ پہلے ون یونٹ کے طور پر مغربی پاکستان تھا' برٹش انڈیا میں بھی ون یونٹ کی حیثیت سے ایک سٹیٹ بن جائے تا کہ اس علاقے میں مسلمانوں کے اندر قومیت' کلچر اور زبانوں کے تھوڑے بہت فرق کے باوجود مل جل کر رہنے سے ایک قوم کا تصور باقاعدہ پیدا ہو جائے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں:

"I therefore demand the formation of a consolidated Muslim State in the best interests of India and Islam."

''لہٰذا میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد میں ایک الگ مسلم ریاست کے بنانے کا مطالبہ کرتا ہوں''۔

اور اس ضمن میں وہ یہ بات کہتے ہیں کہ:

"For Islam (it will be) an opportunity to rid itself of the stamp that Arabian Imperialism was forced to give it, to mobilize its laws, its education, its culture and to bring them into closer contact with its own original spirit and with the spirit of the modern times."

''اسلام کے لیے یہ ایک موقع ہو گا کہ عرب ملوکیت کے تحت اس پر جو پردے پڑ گئے تھے ان سے چھٹکارا حاصل کر سکے اور اپنے قوانین' تعلیمات اور ثقافت کو اپنی اصل روح کے ساتھ روحِ عصر سے ہم آہنگ کر سکے''۔

ویسے تو اور بھی بہت سے لوگوں نے ہندوستان کی تقسیم کی باتیں کی ہیں' لیکن اس ضمن میں اقبال کی حیثیت بہت نمایاں ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں صدر کی حیثیت سے خطبہ دیتے ہوئے یہ بات کی ہے۔ اور اس کا ایک اہم اور مثبت عنصر یہ ہے کہ اقبال کے بقول عرب دورِ ملوکیت میں اسلام کے چہرے پر جو بدنما داغ دھبے پڑ گئے تھے ہمیں موقع مل جائے گا کہ انہیں ہٹا کر اسلام کا روشن چہرہ لوگوں کو دکھا سکیں۔ یہاں نوٹ کیجیے کہ اقبال نے عرب دورِ ملوکیت کی بات کی ہے' اور عرب دورِ ملوکیت سے پہلے خلافت راشدہ ہے جو اصل اسلام تھا۔ دورِ بنوامیہ تو اسلام نہیں تھا۔ یہ تو وہی دَور ہے جس میں سانحۂ کربلا ہوا ہے' واقعۂ حرّہ ہوا ہے' ظلم کی انتہا ہوئی ہے اور سینکڑوں تابعین کو حجاج بن یوسف نے شہید کیا ہے۔ اس کو حدیث کے اندر بھی **مُلکًا عاضًّا** (کاٹ کھانے والی ملوکیت) کہا گیا ہے۔ بنواُمیہ کے بعد بنوعباس کا دَور آیا ہے جس میں شاندار محل بنے ہیں۔ اقبال کے بقول اب دنیا تو اسلام کو ملوکیت کے آئینے میں دیکھتی ہے کہ یہی اسلام ہے' جبکہ اس میں تو کوئی شے ایسی نہیں ہے جو کسی قوم کو اسلام کی طرف کھینچ سکے۔ چنانچہ دَورِ ملوکیت سے پہلے دَور سے اقبال کی مراد خلافتِ راشدہ ہی ہے' اگرچہ انہوں نے خلافت راشدہ کا نام نہیں لیا اور اس میں بھی اقبال نے بڑی حکیمانہ بات کی ہے کہ اس زمانے کے جو تقاضے ہیں ان کے مطابق اجتہاد کے دروازے کھول کر یہاں پر خلافتِ راشدہ کی طرز کا نظام قائم کیا جائے۔

یہ ہے وہ چیز جس نے تحریک مسلم لیگ کے اندر ایک مثبت جذبہ پیدا کیا۔ ورنہ ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک تحریک مسلم لیگ صرف ایک منفی محرک (negative motive) پر چل رہی تھی اور وہ منفی محرک تھا ہندو کا خوف کہ ہندو ہمیں دبا لے گا' وہ معاشی' تہذیبی' ثقافتی اور مذہبی ہر لحاظ سے ہمارا استحصال کرے گا۔ شدھی کی تحریک کے ذریعے ہمیں راستہ دکھایا جا رہا ہے کہ ہندوستان چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔ یہ سارا خوف کا عنصر تھا اور پیش نظر یہ تھا کہ ہمارے تحفظات دور ہو جائیں اور ہمیں یقین دہانی ہو جائے کہ مسلمانوں کو دبایا نہیں جائے گا' بلکہ مسلمانوں کے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ مسلم لیگ اُس وقت تک کوئی عوامی جماعت تھی ہی نہیں' بلکہ کچھ خواص درجے کے لوگوں مثلاً نوابوں اور نواب زادوں کی

جماعت تھی۔ لیکن ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد میں اقبال نے اس میں ایک انجکشن لگا کر مثبت جذبہ پیدا کیا اور اس نے ایک عوامی جماعت کی حیثیت اختیار کر لی۔ میں اس کے لیے مثال دیا کرتا ہوں کہ کوئی مریض بستر پر پڑا ہوا ہے اور اسے گلوکوز کی بوتل لگی ہوئی ہے' اب اسے کوئی انجکشن لگانا ہے تو اسی بوتل میں لگا دیتے ہیں تا کہ مریض کو مزید تکلیف نہ ہو۔ تو گویا مسلم لیگ کا جو نظام چل رہا تھا اقبال نے اس میں ایک انجکشن لگا دیا۔

لندن میں اقبال اور جناح کی نتیجہ خیز ملاقات

اس کے بعد یہی انجکشن علامہ اقبال نے لندن میں مسٹر محمد علی جناح کے ذہن وفکر میں لگایا۔ لندن میں تین گول میز کانفرنسیں ہوئی تھیں۔ محمد علی جناح پہلی اور دوسری کانفرنس میں تو شریک تھے لیکن تیسری کانفرنس جو ۱۹۳۲ء میں ہوئی اس میں شریک نہیں ہوئے' اس لیے کہ وہ سیاست کو خیر باد کہہ کر قانون کی پریکٹس کر رہے تھے۔ علامہ اقبال اس میں شریک ہوئے تو انہیں لندن میں محمد علی جناح سے ملاقاتیں کرنے اور گفتگوئیں کرنے کا موقع ملا۔ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں علامہ اقبال نے محمد علی جناح کے ذہن وفکر کے اندر یہ انجکشن لگایا کہ آپ اسلام کے احیاء کی بات کریں' یہ چیز مسلمانوں کے جذبات کے اندر گرمی اور حرارت پیدا کرے گی۔ اسی سے پھر محمد علی جناح کے مزاج میں ایک تبدیلی آئی اور ۱۹۳۴ء میں آپ مسلم لیگ میں واپس آ گئے اور انہیں مسلم لیگ کا تاحیات صدر بنا دیا گیا۔ انہوں نے مسلم لیگ کو ذرا سنبھالا تو دیا لیکن انہیں ابھی اسے سنبھالنے کا پوری طرح موقع نہیں مل سکا تھا۔ لہٰذا ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں کانگریس فیصلہ کن اکثریت سے جیت گئی۔ اس دور میں کانگریس کی جو وزارتیں بنیں انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو برا سلوک روا رکھا' جو مظالم ڈھائے اور ان کے حقوق کو جس طرح پامال کیا اس سے وہ منفی محرک اور بھی قوی ہو گیا۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ محمد علی جناح نے ۱۹۳۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک پورے دس برس اسلام کی قوالی گائی۔ یعنی دس برس تک مسلسل تکرار کے ساتھ صرف اسلام کی بات کی کہ ہمیں اسلام چاہیے' ہم اسلامی تہذیب' اسلامی قوانین چاہتے ہیں جو ہندو قوانین سے یکسر الگ ہیں۔ اسلام صرف ہمارا مذہب نہیں ہے' بلکہ دین ہے' یہ زندگی کے تمام معاملات پر حاوی ہے۔ اس چیز نے مسلمانوں کے اندر ایک ولولۂ تازہ پیدا کر دیا۔ جیسے اقبال نے کہا:

اِک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

اب محمد علی جناح کی زبان سے جب یہ آواز بلند ہوئی جو مسلمانوں کے دلوں کی آواز اور ان کی روح کی پکار تھی تو سب نے اس پر لبیک کہا اور اب مسلم لیگ ایک عوامی جماعت بن گئی اور محمد علی جناح اب ''قائداعظم'' قرار پائے۔

قائداعظم کا علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت

میرے اس تجزیے کی رو سے نظریۂ پاکستان' اسلام اور خلافت راشدہ کے مفہوم میں احیائے اسلام' اس کے خالق اقبال ہیں' اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ بات قائداعظم محمد علی جناح تک پہنچانے والے بھی اقبال ہی تھے۔ اس حقیقت کو بہت سے لوگ آسانی کے ساتھ تسلیم نہیں کریں گے' لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ خود قائداعظم نے علامہ اقبال کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کے دو اقتباس آپ کے سامنے رکھ دوں۔ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال کا انتقال ہوا۔ اُس وقت کلکتہ میں فلسطین کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے قائداعظم کی صدارت میں ایک بہت بڑا جلسہ ہو رہا تھا۔ اس جلسے کے بارے میں سٹار آف انڈیا کی ۲۲/اپریل ۱۹۳۸ء کی یہ خبر ملاحظہ کیجیے:

"A mammoth public meeting of the Muslims of Calcutta was held on the football ground on 21 April to consider the Palistine problem, but it was converted into a condolence meeting to mourn the death of Allama Iqbal. Mr. M.A.Jinnah presided.
Mr. M.A. Jinnah said that the sorrowful news of the death of Dr. Sir Muhammad Iqbal had plunged the world of Islam in gloom and mourning. Sir Muhmmad Iqbal was undoubtedly one of the greatest poet, philosophers and seers of humanity of all times."

''مسئلہ فلسطین پر غور کرنے کے لیے ۲۱/اپریل کو کلکتہ کے مسلمانوں کا ایک عظیم الشان جلسہ فٹ بال گراؤنڈ میں منعقد ہوا' لیکن یہ جلسہ علامہ اقبال کی وفات کے

سوگ میں ایک تعزیتی جلسے میں تبدیل ہو گیا۔ اس کی صدارت مسٹر محمد علی جناح نے کی۔ مسٹر محمد علی جناح نے فرمایا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وفات کی افسوسناک خبر نے دنیائے اسلام کو گہرے رنج اور افسوس میں مبتلا کر دیا ہے۔ سر محمد اقبال بلاشبہ ایک عظیم شاعر، فلسفی اور ہمہ وقت صاحبِ بصیرت انسان تھے''۔

''seers'' اُن اصحابِ بصیرت کو کہا جاتا ہے جنہیں مستقبل کو دیکھنے کی صلاحیت حاصل ہوتی ہے، جیسے اقبال نے کہا: ع ''گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود''۔۔۔ اور: ؎

آبِ روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب

قائداعظم مزید فرماتے ہیں:

"He took a prominent part in the politics of the country and in the intellectual and cultural reconstruction of the Islamic world. His contribution to the literature and thought of the world will live for ever."

''انہوں نے ملکی سیاست میں نمایاں حصہ لیا اور دنیائے اسلام کی علمی و ثقافتی تجدید میں اہم کردار ادا کیا۔ دنیائے ادب میں ان کی تحریر و تقریر کا جو حصہ ہے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا''۔

اب قائداعظم کا آخری جملہ ملاحظہ کیجیے جو انہوں نے اقبال کے بارے میں کہا:

" To me he was a personal friend, philosopher and guide and as such the main source of my inspiration and spiritual support."

''وہ میرے ذاتی دوست، فلسفی اور رہنما تھے۔ وہ میرے لیے تشویق، فیضان اور روحانی قوت کا سب سے بڑا ذریعہ تھے''۔

اس کے بعد کوئی شک رہ جاتا ہے؟ اور یہ الفاظ کون کہہ رہا ہے؟ محمد علی جناح۔ وہ کوئی لفاظ قسم کے آدمی نہیں تھے، کوئی شعلہ بیان خطیب نہیں تھے۔ وہ تو بہت بڑے وکیل اور ایک ایک لفظ کو تول تول کر بولنے والے انسان تھے۔

۱۹۴۰ء میں اقبال ڈے منایا گیا اور اس میں قائداعظم نے فرمایا:

"If I live to see the ideal of a Muslim State being achieved in India, and I were then offered to make a choice between the works of Iqbal and the rulership of the Muslim Steate, I would prefer the former".

''اگر میں ہندوستان میں ایک مثالی اسلامی ریاست کے حصول تک زندہ رہا اور اُس وقت مجھے یہ اختیار دیا گیا کہ میں اقبال کے کلام اور اس مسلم ریاست کی حکمرانی میں سے ایک کا انتخاب کر لوں تو میں اقبال کے کلام کو ترجیح دوں گا''۔

Continuing, Mr. Jinnah said that in April 1936, he thought of transforming the Muslim League, which was then only an academical institution, into a parliament of the Muslims of India. From that time to the end of his life, he continued, Iqbal stood like a rock by him. Iqbal, Mr. Jinnah said, was not only a great poet who had a permanent place in the history of the world's best literature, he was a dynamic personality who, during his lifetime, made the greatest contribution towards rousing and developing of Muslim national consciousness.

''اسی تسلسل میں مسٹر جناح نے فرمایا کہ اپریل ۱۹۳۶ء میں انہوں نے مسلم لیگ کو جو اُس وقت صرف ایک اصولی ادارہ تھا، ہندوستان کے مسلمانوں کی پارلیمنٹ میں تبدیل کرنے کے متعلق سوچا۔ اُس وقت سے زندگی کے آخری دن تک اقبال ان کے ساتھ چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ مسٹر جناح نے فرمایا کہ اقبال صرف ایک عظیم شاعر ہی نہ تھے جو ادبی دنیا کی تاریخ میں ایک بہترین ادیب جانے جاتے بلکہ وہ ایک متحرک شخصیت تھے، جنہوں نے اپنی زندگی میں مسلمانوں کے قومی شعور کو بیدار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا''۔

تحریکِ پاکستان میں مسلمانانِ ہند کا جوش و جذبہ

قائداعظم محمد علی جناح نے جب اسلام کا راگ الاپا اور قوالی گائی تو اس کے نتیجے میں قوم کو ''حال'' آ گیا۔ آپ ذرا سوچیے کہ مسلم اقلیتی صوبوں کے لوگوں نے مسلم لیگ کو کیوں ووٹ دیے؟ کیا اتر پردیش اور مدراس پاکستان میں آ سکتے تھے؟ اور کیا بمبئی اور CP

پاکستان کا حصہ بن سکتے تھے؟ یہ بات بظاہر عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے' لیکن یہ دراصل مسلمانوں کے حال میں آنے کا نتیجہ تھا۔ جہاں جذبات کی حکمرانی ہو جاتی ہے وہاں عقل ایک طرف رہ جاتی ہے' ورنہ اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ پاکستان کے ساتھ کسی تعلق کے نہ ہونے کے باوجود اقلیتی صوبوں کے مسلمان پاکستان کے لیے مسلم لیگ کو ووٹ دیتے۔ قرارداد پاکستان ۱۹۴۰ء میں منظور ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کامیاب ہوگئی اور اسے پورے ہندوستان میں نہ صرف اکثریتی صوبوں میں بلکہ اقلیتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

اس دوران میں دعائیں بھی بہت مانگی گئیں اور نعرہ لگایا گیا: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ''۔ اگرچہ کچھ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ کوئی سنجیدہ نعرہ نہیں تھا' بلکہ بچوں کا بنایا ہوا نعرہ تھا۔ بے شک یہ بچوں کا بنایا ہوا نعرہ ہو لیکن بہرحال یہ مسلمانانِ ہند کے دلوں کی آواز بنا ہے۔ میں تو خود اُن لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے یہ نعرے لگائے ہیں۔ اُس وقت میں ہائی سکول کے طالب علم کی حیثیت سے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ضلع حصار کا جنرل سیکرٹری تھا۔ ہم نے جلسوں' جلوسوں میں یہ نعرے لگائے ہیں اور جمعہ اور عیدین کے اجتماعات میں گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگی ہیں کہ اے اللہ! ہمیں انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے نجات دے دے' ہمیں ایک آزاد خطۂ ارضی عطا فرما' وہاں پر ہم تیرے دین کا بول بالا کریں گے اور تیرے نبی ﷺ کی شریعت نافذ کریں گے۔ درحقیقت اگر یہ نعرہ اور پیغام نہ ہوتا تو پورے ہندوستان کے مسلمان ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں مسلم لیگ کو ووٹ نہ دیتے۔ لہٰذا اس اعتبار سے یہی فیصلہ کن نظریہ تھا جو پاکستان کی بنیاد بنا۔

اسی زمانے میں ہندو مسلم کشاکش بھی انتہا کو پہنچ گئی۔ چونکہ ہندوؤں کے لیے بھارت ماتا نہایت مقدس تصور ہے اور الگ وطن کا مطالبہ کر کے مسلمان گویا بھارت ماتا کو ٹکڑے کرنا چاہتے تھے لہٰذا ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت اور دشمنی پیدا ہوگئی اور اس دشمنی کا ظہور تقسیم ہند کے وقت ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں کا قتل عام ہوا' انسان بھیڑیوں سے بڑھ کر سفاک بنا' چھوٹے چھوٹے بچوں کو اچھال کر نیزوں میں پرویا گیا' لاکھوں عورتوں کی عصمت دری ہوئی' بے شمار عورتیں اغوا ہوئیں' لاکھوں آدمی قتل ہوئے۔ ایک کروڑ انسان اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر منتقل ہوئے۔ آبادی کی اتنی بڑی ہجرت تاریخ انسانی میں کبھی نہیں ہوئی۔

اس کے حوالے سے میں قائد اعظم کا ایک اور اقتباس پیش کر رہا ہوں' جو ۱۸ جنوری ۱۹۴۶ء کو سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا۔ حبیبیہ ہال' اسلامیہ کالج لاہور میں مسلمان خواتین کا ایک اجلاس ہوا جس میں قائداعظم نے فرمایا:

"If we do not succeed in our struggle for Pakistan, the very trace of Muslims and Islam will be obliterated from the face of India.

''اگر ہم پاکستان کے حصول کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے تو ہندوستان سے مسلمانوں اور اسلام کا نام ونشان مٹ جائے گا''۔

اور یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ اس طرح ہسپانیہ کی تاریخ دہرائی جاتی۔ وہاں بھی مسلمانوں نے آٹھ سو برس حکومت کی تھی' لیکن پھر وہ وقت آیا کہ پندرہویں صدی کے آخر اور سولہویں صدی کے شروع میں وہاں مسلمانوں کا ایک بچہ تک باقی نہیں رہا۔ سارے کے سارے مسلمان یا تو قتل کر دیے گئے' یا زندہ جلا دیے گئے یا انہیں جہازوں میں بھر بھر کر افریقہ کے شمالی ساحل پر پھینک دیا گیا۔ وہاں غرناطہ کے محل اور مسجد قرطبہ اب بھی قابل دید ہیں' جو مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی تہذیب کا مرثیہ کہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کہا تھا: ؎

ہسپانیہ تو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تو میری نظر میں!

وہی معاملہ ہندوستان میں بھی ہو سکتا تھا۔ یہ قائداعظم کے الفاظ ہیں جن کی میں تائید کرتا ہوں' اس لیے کہ اُس وقت ہندو جارحیت اور تشدد پرستی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور ہندو کے جذبات بھی انتہا کو پہنچ گئے تھے' اور اس کے بعد یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔

پاکستان کا معجزانہ قیام

اس پس منظر میں مَیں جو بات کہنا چاہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ پاکستان کا قیام اصل میں

اللہ تعالیٰ کی حکمت عملی، اس کی مشیت اور اس کی تدبیر سے ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ اگر کوئی قوم اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرے کہ اے اللہ! ہمیں آزادی دے دے، ہم تیرے دین کا بول بالا کریں گے، تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور آزادی دیتا ہے۔

آغازِ خطاب میں جو دو آیات تلاوت کی گئیں وہ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان پر کافی حد تک منطبق ہوتی ہیں۔ ایک آیت سورۃ الانفال کی ہے: ﴿وَاذۡکُرُوۡۤا اِذۡ اَنۡتُمۡ قَلِیۡلٌ مُّسۡتَضۡعَفُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ﴾ ''یاد کرو وہ وقت جبکہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا'' ...... ہندوستان میں مسلمانوں کی بعینہٖ یہی کیفیت تھی کہ ہندو مسلمانوں کو کمزور سمجھتے ہوئے ان پر غالب آ رہا تھا۔ ﴿تَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّتَخَطَّفَکُمُ النَّاسُ﴾ ''تم ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں'' ...... ہندوستان میں مسلمانوں کو یہی خوف لاحق تھا کہ اگر ہندوستان ''ایک فرد ایک ووٹ'' کے اصول پر آزاد ہو گیا تو ہندو انہیں مٹا دے گا اور ختم کر دے گا۔ ﴿فَاٰوٰىکُمۡ وَاَیَّدَکُمۡ بِنَصۡرِہٖ وَرَزَقَکُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ ''تو اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی، اور اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمہیں پاکیزہ رزق پہنچایا تاکہ تم شکر کرو''۔ اور شکر کا تقاضا ہے کہ اس ملک خداداد میں اللہ کا دین قائم کرو جس کا تم نے وعدہ کیا تھا، جس کے لیے دعائیں کی تھیں۔

دوسری آیت سورۃ الاعراف کی ہے۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی تھی کہ اے موسیٰ! آپ کے آنے سے پہلے بھی فرعونی ہم پر ظلم ڈھا رہے تھے اور آپ کے آنے کے بعد بھی ہماری تقدیر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: ﴿عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّہۡلِکَ عَدُوَّکُمۡ وَیَسۡتَخۡلِفَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرَ کَیۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۹﴾﴾ ''قریب ہے وہ وقت کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلیفہ بنائے، پھر دیکھے کہ تم لوگ کیسے عمل کرتے ہو''۔ پاکستان کا معرض وجود میں آ جانا بھی ایک طرح سے ہندوؤں کی ہلاکت تھی۔ مہاتما گاندھی چند مہینے پہلے کہہ چکا تھا کہ پاکستان صرف میری لاش پر بن سکتا ہے۔

اس سب کے باوجود پاکستان کیسے معرض وجود میں آ گیا؟ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک معجزہ تھا، ورنہ کسی حساب کتاب کے ذریعے بھی پاکستان کا وجود میں آنا ممکن نہیں تھا[1]۔ اس لیے کہ ہندو عددی اعتبار سے بھی مسلمانوں سے تین گنا تھے۔ وہ مسلمانوں سے تعلیم، تنظیم، پیسہ، تجارت، صنعت غرض ہر لحاظ سے آگے تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خود مسلمانوں کے نہایت مؤثر حلقے پاکستان کے قیام کے خلاف تھے۔ ابوالکلام آزاد جیسا نابغہ (genious) شخص برہمو سماج کے زیر اثر آ گیا تھا۔ جیسے گاندھی خود کہتا ہے کہ میں راجہ رام موہن رائے کا چیلا ہوں اور وہ میرا گُرو ہے، اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد بھی اسی کے سحر سے متأثر ہو گئے تھے۔ جمعیت علماء ہند جو بہت بڑی جماعت اور بہت بڑی طاقت تھی، قیامِ پاکستان کے خلاف اور وطنی قومیت کی حامی تھی۔ چنانچہ علامہ اقبال کو یہ کہنا پڑا: ؎

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است!
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است![2]

پنجاب میں ''احرار'' ایک بہت بڑی عوامی طاقت تھی۔ جیسے مقررین اور خطیب اس نے پیدا کیے آج تک کسی اور جماعت نے پیدا نہیں کیے۔ وہ بھی قیام پاکستان کے خلاف تھی۔ سرحد میں سرحدی گاندھی کی خدائی خدمت گار تحریک جو بڑی عوامی تحریک تھی، پاکستان کی دشمن تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قیام پاکستان کے وقت انگلستان میں لیبر پارٹی کی حکومت تھی جو اکھنڈ ہندوستان کی حامی تھی۔ وزیر اعظم لارڈ اٹیلی قائداعظم سے شدید نفرت کرتا تھا اور وائسرائے

(۱) اس کی تفصیل ''استحکام پاکستان'' نامی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔

(۲) یہ دوسری بات ہے کہ جب مولانا مدنیؒ نے یہ وضاحت فرمائی کہ: اوّلاً انہوں نے لفظِ قوم کا استعمال کیا تھا ملت کا نہیں! اور ثانیاً: انہوں نے صرف موجودہ دور کی عام روش کا ذکر کیا تھا، نہ اُس کی وکالت کی تھی نہ ہی مسلمانوں کو اس کے قبول کرنے کی تلقین کی تھی تو علامہ اقبال نے فوراً اعتراف کیا کہ اس پر اعتراض کا مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے اور اپنے اشعار سے بھی رجوع کر لیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن گاندھی کا چیلا تھا۔ اس سب کے باوجود پاکستان کا وجود میں آنا اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت کا نتیجہ تھا اور یہ بہت اہم نکتہ ہے۔

میرے نزدیک اس کی آخری دلیل یہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں قائداعظم نے کیبنٹ مشن پلان قبول کر لیا تھا۔ وہ پلان یہ تھا کہ ہندوستان ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہوگا، مرکزی حکومت ایک ہوگی لیکن تین زون ہوں گے۔ دس سال کے بعد اگر کوئی زون علیحدہ ہونا چاہے تو اسے اس کا اختیار ہوگا۔ قائداعظم نے اسے مان لیا تو پورے ہندو پریس میں مذاق اڑایا گیا کہ بس پاکستان کا مطالبہ ختم ہوا۔ یہ مسلم لیگ اور قائداعظم کے لیے بہت ہی نازک وقت تھا۔ لیکن قائداعظم کے اس پلان کو تسلیم کر لینے کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ جانتے تھے کہ اب انگریز ہندوستان سے ہر قیمت پر جائے گا، اس لیے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد انگریزی حکومت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ وہ اپنی دور دراز کی نوآبادیوں کو کنٹرول نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ انگریز ۱۹۴۸ء میں ہندوستان چھوڑ دینے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ اب ۱۹۴۶ء میں جب کیبنٹ مشن پلان آیا تو قائداعظم کو محسوس ہوا کہ اگر ہم نے اس وقت اس پلان کو نہ مانا تو عین ممکن ہے کہ انگریزی حکومت یکطرفہ طور پر اقتدار منتقل کر کے رخصت ہو جائے۔ اس صورت میں ایک دفعہ مرکزی حکومت اگر ہندوؤں کے ہاتھ میں آ گئی تو پھر پاکستان کے قیام کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا قائداعظم نے سوچا کہ کیبنٹ مشن پلان میں دس سال کے بعد تو پاکستان کا خاکہ موجود ہے کہ کوئی زون اگر علیحدہ ہونا چاہے تو ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اسے قبول کر لیا جائے۔ لیکن اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی مداخلت (Divine intervention) کی بنا پر کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کے منہ سے سچی بات نکل گئی کہ ایک دفعہ ہندوستان ایک وحدت کی شکل میں آزاد ہو جائے اور مرکزی حکومت قائم ہو جائے تو پھر کون کسی کو علیحدہ ہونے دیتا ہے! حدیث شریف میں الفاظ آئے ہیں کہ تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ انہیں جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ چنانچہ پنڈت نہرو کے منہ سے سچی بات نکل گئی: ؎

نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں
فقیہہ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا!

اس پر قائداعظم نے اس مشن کو فوراً رد کر دیا کہ اگر تمہاری نیتیں یہی ہیں تو پھر ہم اسے ہرگز تسلیم نہیں کرتے۔ اس کے نتیجے میں پاکستان بننے کی راہ ہموار ہوئی اور پاکستان بن گیا۔ بالفاظِ دیگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس موقع پر نہرو خاموش رہ جاتا تو مرکزی حکومت بننے کی صورت میں پاکستان کبھی وجود میں نہ آتا۔ ساٹھ برس گزرنے کے باوجود بھی انہوں نے ہمیں کشمیر کا ایک انچ نہیں دیا تو زون کی شکل میں پورا ملک کیسے دے دیتے؟ یہ ناممکنات میں سے تھا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اپنی نیت کا کھوٹ دل میں نہ رکھ سکا اور بول پڑا جس کے نتیجے میں پورا نقشہ تبدیل ہو گیا اور پاکستان کے نام سے کرۂ ارضی پر ایک ریاست وجود میں آ گئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''India Wins Freedom'' میں اپنے سیاسی کیریئر کی بس ایک ہی غلطی تسلیم کی ہے کہ میرا کانگریس کی صدارت سے استعفاء دینا ایک غلطی تھی۔ یعنی اُس وقت کانگریس کا صدر پنڈت جواہر لعل نہرو کے بجائے اگر میں ہوتا تو ہندوستان ''کیبنٹ مشن پلان'' کے تحت آزاد ہوتا اور پاکستان وجود میں نہ آتا۔ دراصل یہ پلان ابوالکلام آزاد ہی کے ذہن کی پیداوار تھا۔ بہرحال پاکستان کا وجود اللہ تعالیٰ کی خاص مشیت تھی۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ جب کچھ لوگ اس سے اُس کی بندگی کے لیے آزادی مانگتے ہیں تو اللہ انہیں آزادی دے کر آزماتا ہے کہ اب تم کیا کرتے ہو۔

قائداعظم کا تصورِ پاکستان

۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک قائداعظم نے اسلام کا جو راگ الاپا ہے اس پر ان کے ایک سو اقتباسات (quotations) موجود ہیں۔ ان دس سالوں کے دوران انہوں نے اپنی تقاریر میں برملا کہا ہے کہ ہمارا قانون، ہمارا نظام، بلکہ ہماری ہر شے اسلام کے مطابق ہوگی۔ ان کے علاوہ ان کی تقاریر کے چالیس اقتباسات اور بھی ہیں جو ان کی پاکستان بننے کے بعد کی تقاریر سے ماخوذ ہیں جن میں انہوں نے اسلام ہی کی بات کی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کا سیکولر حلقہ ان کی صرف ایک تقریر کے چند الفاظ کو ان کے باقی تقریباً ڈیڑھ سو خطابات پر

حاوی قرار دے کر اسے دستورِ پاکستان کا حصہ بنانا چاہتا ہے[1]۔ میں یہاں پر قائداعظم محمد علی جناح کی تقاریر کے صرف دو حوالے دوں گا' جس سے اندازہ کیجیے کہ یہ مسٹر محمد علی جناح بول رہے ہیں یا مولانا محمد علی جناح خطاب فرما رہے ہیں! ۱۱ جنوری ۱۹۳۸ء کو گیا ریلوے سٹیشن (بہار) پر ایک بہت بڑے مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا کر فرمایا:

"Today in this huge gathering you have honoured me by entrusting the duty to unfurl the flag of the Muslim League, the flag of Islam, for you can not separate the Muslim League from Islam. Many people misunderstand us when we talk of Islam particularly our Hindu friends. When we say `This flag is the flag of Islam' they think we are introducing religion into politics- a fact of which we are proud. Islam gives us a complete code. It is not only religion but it contains laws, philosophy and politics. In fact, it contains everything that matters to a man from morning to night. When we talk of Islam we take it as an all-embracing word. We do not mean any ill will. The foundation of our Islamic code is that we stand for liberty, equality and fraternity."

''آج اس عظیم الشان اجتماع میں آپ نے مجھے مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانے کا اعزاز بخشا ہے۔ یہ جھنڈا درحقیقت اسلام کا جھنڈا ہے' کیونکہ آپ مسلم لیگ کو اسلام سے علیحدہ نہیں کر سکتے۔ بہت سے لوگ بالخصوص ہمارے ہندو دوست ہمیں غلط سمجھے ہیں۔ جب ہم اسلام کی بات کرتے ہیں یا جب ہم کہتے ہیں کہ یہ جھنڈا اسلام کا جھنڈا ہے تو وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم مذہب کو سیاست میں گھسیٹ رہے ہیں' حالانکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہم فخر کرتے ہیں۔ اسلام ہمیں مکمل ضابطۂ حیات دیتا ہے۔ یہ نہ صرف ایک مذہب ہے بلکہ اس میں قوانین' فلسفہ اور سیاست سب کچھ ہے۔ درحقیقت اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کی ایک آدمی کو صبح سے رات تک ضرورت ہوتی ہے۔ جب ہم اسلام کا نام لیتے ہیں تو ہم اسے ایک کامل لفظ کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ ہمارا کوئی غلط مقصد نہیں' بلکہ ہمارے اسلامی ضابطہ کی بنیاد آزادی' عدل و مساوات اور اخوت ہے''۔

اس کے بعد آپ ۶ مارچ ۱۹۴۶ء کو فرماتے ہیں:

"Let us go back to our holy book the Quran; let us revert to the Hadith and the great traditions of Islam, which have every thing in them for our guidance if we correct interpret them and follow our great holy book the Quran."

''ہمیں قرآن پاک' حدیث شریف اور اسلامی روایات کی طرف رجوع کرنا ہوگا جن میں ہمارے لیے مکمل رہنمائی ہے' اگر ہم ان کی صحیح ترجمانی کریں اور قرآن پاک پر عمل پیرا ہوں''۔

یہاں پر قائداعظم محمد علی جناح کی تقاریر کی چند شہ سرخیاں پیش خدمت ہیں:

۶ جون ۱۹۳۸ء: ''مسلم لیگ کا جھنڈا نبی اکرم ﷺ کا جھنڈا ہے''۔

۲۲ نومبر ۱۹۳۸ء: ''اسلام کا قانون دنیا کا بہترین قانون ہے''۔

۸/اپریل ۱۹۳۸ء' اسٹار آف انڈیا: ''ملتِ اسلامیہ عالمی ہے''۔

۷/اگست ۱۹۳۸ء: ''مَیں اوّل و آخر مسلمان ہوں''۔

۹/نومبر ۱۹۳۹ء: ''مغربی جمہوریت کے نقائص''۔

۱۴ نومبر ۱۹۳۹ء: ''انسان خلیفۃ اللہ ہے''۔

ٹائمز آف لندن' ۹ مارچ ۱۹۴۰ء: ''ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں''۔

۲۶ مارچ ۱۹۴۰ء: ''میرا پیغام قرآن ہے''۔

قائداعظم نے اقلیتوں کو بھی کچھ یقین دہانیاں کرائیں کہ ان کو خوف نہیں ہونا چاہیے'

---

(۱) انجمن خدام القرآن سندھ نے قائد اعظم محمد علی جناح کے مذکورہ بالا اقتباسات میں سے کچھ کو "Quaid-e-Azam Speaks His Vision of Pakistan" نامی کتاب میں شائع کیا ہے' اور اب مزید اضافے کے ساتھ اس کا ایک نیا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے' تاکہ جھوٹ کو کفن پہنا کر دفن کر دیا جائے۔

ان کے ساتھ پاکستان میں فراخ دلانہ سلوک کیا جائے گا۔ اس ضمن میں ان کی ۲۹ مارچ ۱۹۴۴ء کی تقریر سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں شائع ہوئی، جس کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

Mr. Jinnah assured the non-Muslim minorities that if Pakistan was established, they would be treated with fairness, justice and even generosity. This was enjoined upon them by the Quran and this was the lesson of their history had taught them with a few exceptions in which some individuals may have misbehaved."

''مسٹر جناح نے غیر مسلم اقلیتوں کو یقین دلایا کہ اگر پاکستان قائم ہو گیا تو اُن کے ساتھ رواداری، انصاف اور فیاضی کا سلوک کیا جائے گا۔ اقلیتوں کو یہ حقوق قرآن نے دیے ہیں اور مسلمانوں کی تاریخ ان کو یہی سبق سکھاتی ہے، البتہ چند استثنائی صورتوں میں ممکن ہے کہ بعض افراد سے بدسلوکی کی گئی ہو''۔

اب اسی کے حوالے سے قائداعظم کی ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا صرف ایک جملہ ایسا ہے کہ جسے سیکولر ذہن رکھنے والے دانشوروں نے سیکولرزم کی بنیاد قرار دے لیا ہے، اور جسٹس منیر نے تو اس ایک جملے پر پوری کتاب لکھ دی ہے۔ حالانکہ اس جملے کا بھی ۹۵ فیصد حصہ اسلامی ہے، صرف ۵ فیصد حصہ ایسا ہے جس کی مختلف تعبیرات کی گئی ہیں اور اس سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قائداعظم پاکستان کو ایک سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے۔ اس خطاب میں انہوں نے کہا تھا:

"You are free; you are free to go to your temples, you are free to go to your mosques or to any other places of worship in this State of Pakistan."

''آپ آزاد ہیں، آپ کو اپنے معبدوں میں جانے کی اجازت ہے، پاکستان کی اس ریاست میں آپ کو اپنی مساجد یا کوئی بھی دوسری عبادت گاہوں میں جانے کی آزادی ہے''۔

اور یہ بالکل صحیح ہے کہ اسلامی ریاست میں بھی مذہبی آزادی سب کو ملتی ہے۔ صرف قریش کا معاملہ خصوصی تھا، اور ان کے لیے یہ حکم تھا جو سورۃ التوبۃ کی ابتدائی چھ آیات میں وارد ہوا کہ اگر ایمان نہیں لاؤ گے تو قتل کر دیے جاؤ گے۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ خود قریشی تھے اور آپ ؐ کی قریش کی طرف خصوصی بعثت تھی۔ بعد میں سب کے لیے یہی اصول تھا کہ اسلام لے آؤ تو ہمارے برابر کے ساتھی ہو گے۔ ہم یہ بھی دعویٰ نہیں کریں گے کہ ہم سینئر مسلمان ہیں اور تم جونیئر مسلمان ہو، ہمارے حقوق زیادہ ہیں اور تمہارے کم۔ البتہ اگر اسلام نہیں لاتے تو جزیہ دو اور چھوٹے بن کر رہو، لیکن تمہیں مکمل مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔ اور پوری تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ کہیں پر بھی اور کسی ایک شخص کو بھی بالجبر مسلمان نہیں بنایا گیا۔ ہاں اگر طاقت ہے تو نظام صرف اللہ کا ہو گا، دین صرف اللہ کا قائم کیا جائے گا، اس لیے کہ انسانوں کے لیے اسی نظام میں رحمت ہے، سوشل جسٹس ہے، جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے ذریعے نوع انسانی کو عطا کیا ہے۔ باقی یہ کہ مذہبی آزادی سب کو حاصل ہے۔ اسی خطاب میں قائداعظم نے فرمایا:

" You will find that in course of time Hindus would cease to be Hindus and Muslims would cease to be Muslims, not in the religious sense, because that is the personal faith of each individual, but in the political sense as citizens of the State."

اس میں قائداعظم نے یہ جو فرمایا ہے کہ ''مذہب ہر شخص کا انفرادی معاملہ ہے''، اس وقت پوری دنیا کا اصول یہی ہے۔ البتہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ مذہب نہیں ہے، بلکہ دین ہے اور پوری زندگی کا نظام دیتا ہے، اور یہ بات قائداعظم بھی اپنی تقاریر میں کہہ چکے ہیں۔ اگر قائد کے اس جملے کو ان کی بقیہ تقاریر کی روشنی میں سمجھا جاتا تو غلط فہمی کا امکان پیدا نہ ہوتا۔ لیکن غلط فہمی بہرحال پیدا ہوئی ہے۔ یہ کس وجہ سے ہوئی، یہ ایک علیحدہ بحث ہے، جس میں مَیں اس وقت نہیں جانا چاہتا۔ لیکن سیکولر حلقے اس کی جو تعبیر کر رہے تھے قائداعظم نے خود اس کی نفی کر دی تھی۔ چنانچہ ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے دوٹوک انداز میں فرمایا تھا:

"Islamic principles today are as applicable to life as they were thirteen hundred years ago. He could not understand a section of the people who deliberately wanted to create mischief and propaganda that the constitution of Pakistan would not be made on the basis of Shariat."

''اسلامی اصول آج بھی ہماری زندگی کے لیے اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے قابل عمل تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ لوگوں کا ایک گروہ جان بوجھ کر فتنہ اندازی سے یہ بات کیوں پھیلانا چاہتا ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کی بنیاد پر مدوّن نہیں کیا جائے گا''۔

یعنی جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کے مطابق نہیں بنے گا وہ فتنہ پرور اور شرارتی ہیں اور غلط پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔

قائداعظم کے حوالے سے مزید جان لیجیے کہ ان کی وفات سے دو تین دن پہلے پروفیسر ڈاکٹر ریاض علی شاہ صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی اور قائداعظم نے ان سے فرمایا:

''تم جانتے ہو کہ جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن چکا ہے، تو میری روح کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے! یہ مشکل کام تھا اور میں اکیلا اسے کبھی نہیں کر سکتا تھا، میرا ایمان ہے کہ یہ رسول خداؐ کا روحانی فیض ہے کہ پاکستان وجود میں آیا۔ اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں تاکہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے''۔

میں خود یہ کہتا ہوں کہ اس سے پہلے تک میرے دل میں قائداعظم کی عظمت بھی تھی، جذبۂ شکر بھی تھا، لیکن محبت نہیں تھی۔ ۱۱ر ستمبر ۱۹۸۸ء کے روزنامہ جنگ میں مذکورہ بالا الفاظ دیکھ کر ان سے محبت بھی پیدا ہو گئی۔ دیکھئے اس شخص کے اندر کس قدر جذبہ تھا! معلوم ہوا کہ قائداعظم کے علم میں وہ احادیث بھی تھیں جن میں یہ پیشین گوئی ہے کہ قیامت سے قبل پوری دنیا میں نظامِ خلافت قائم ہو گا اور اُمت محمد ﷺ کی حکومت قائم ہو گی۔ ابھی تو حالات خراب سے خراب تر ہوں گے، مزید آزمائشیں آئیں گی ع ''اور کچھ روز فضاؤں سے لہو برسے گا!'' لیکن آخرکار حالات بدلیں گے۔

اس اعتبار سے ایک ذرا دلچسپ اقتباس بھی ملاحظہ فرما لیں۔ ۱۹۴۶ء میں برطانیہ کی پارلیمنٹ کا ایک دس رکنی وفد ہندوستان آیا تھا، جس کے چیئرمین رابرٹ رچرڈ تھے۔ اس وفد کے ایک رکن مسٹر سورن سن (Sorenson) نے واپس جا کر ''My Impression of India'' کے نام سے کتاب لکھی جس میں وہ قائداعظم کے بارے میں لکھتا ہے:

"Mr. Jinnah is the sword of Islam resting in a secular scabbard."

یعنی مسٹر جناح اسلام کی تلوار ہیں، البتہ جس نیام میں وہ تلوار ہے اس میں سیکولر رنگ موجود ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ وضع قطع میں مولوی نہیں تھے اور نہ ہی انہوں نے مسلمانوں میں مشہور اور مقبول ہونے کے لیے کوئی مصنوعی لبادہ اوڑھا۔ یہ ان کی شخصیت کا بہت اہم حصہ ہے۔ وہ اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے بہت مضبوط تھے۔

بہرحال قائداعظم نے پاکستان بنایا اور ان کے دست راست لیاقت علی خان نے ان کے انتقال کے چند ہی ماہ بعد دستور ساز اسمبلی سے قراردادِ مقاصد منظور کرا کے پاکستان میں نظامِ خلافت کی بنیاد قائم کر دی، جو اَب ہمارے دستور کا آرٹیکل 2A ہے۔ اس میں تسلیم کیا گیا کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے اور خلافت انسانوں کی، خاص طور پر مسلمانوں کی جو اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں۔ حاکمِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے، رسول اکرم ﷺ اس کے نمائندے ہیں۔ قرآن و حدیث میں اللہ اور اس کے رسولؐ کا جو حکم آ گیا وہ تو واجب التعمیل اور واجب الاطاعت ہے، اس سے آپ اِدھر اُدھر نہیں جا سکتے، البتہ باقی معاملات قرآن و حدیث کے دائرے کے اندر اندر ''اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ'' کے اصول کے تحت باہمی مشورے سے طے کیے جائیں گے۔ یہ خلافت ہے۔ ہمارے پاس جو اختیارات ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مقدس امانت ہیں جو انہی حدود کے اندر اندر استعمال کیے جائیں گے جو قرآن اور سنت میں معین کر دیے گئے ہیں۔ یہ ایک آرٹیکل درحقیقت دستور کے اندر خلافت کی بنیاد کے قیام کے لیے کافی تھا، بشرطیکہ اس میں اس ایک جملے کا اضافہ کر دیا جاتا:

"It will take precedence over whole of the constitution"

یعنی ’’یہ دفعہ پورے دستور پر حاوی رہے گی‘‘۔
اس صورت میں پھر اس کے بعد کسی دفعہ ۲۲۷ کی ضرورت نہیں تھی‘ بلکہ اس کے مطابق پورے کا پورا دستور اسلامی بن جاتا۔

نظریۂ پاکستان سے ہمارا انحراف

اب آیئے میری گفتگو کے ذرا تلخ حصے کی طرف۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد ع ’’پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی‘‘ کے مصداق اسلام کا وہ کھیل ختم ہو گیا۔ اس کے کیا اسباب تھے اور کون اس کا ذمہ دار تھا‘ یہ ایک الگ بحث ہے‘ لیکن بحیثیت مجموعی پوری قوم تمام مسلمانانِ پاکستان اس کے ذمہ دار اور مجرم ہیں کہ اس کے بعد اسلام کی طرف کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔ اسلام کا سوشل جسٹس کا نظام‘ عدلِ اجتماعی‘ اخوت و بھائی چارہ‘ مساوات اور آزادی‘ یہ سب کہاں ہیں؟ پاکستان کی سیاست اور حکومت پر سیکولرزم کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ اور اب تو روشن خیالی کے نام سے نئے اَبعاد (dimensions) کا اضافہ کیا جا رہا ہے اور بات آگے سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

ہماری معیشت سود پر مبنی ہے‘ حالانکہ اسلام کی رو سے سود سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ہے۔ کسی گناہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے چیلنج نہیں آیا‘ لیکن سود کے گناہ پر اللہ کی طرف سے چیلنج آیا ہے کہ اگر باز نہیں آتے: ﴿فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾ (البقرۃ:۲۷۹) ’’تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے‘‘۔ سود کی شناعت اور شدت کے بارے میں نبی اکرمﷺ کی یہ حدیث مبارکہ بھی ہے کہ: ((اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ حُوْبًا‘ اَیْسَرُھَا اَنْ یَّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ)) (ابن ماجہ) ’’سود کے گناہ کے ستر حصے ہیں (کچھ چھوٹے ہیں اور کچھ بڑے ہیں) اور سب سے ہلکا گناہ اس کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے‘‘۔ اور مفکر پاکستان علامہ اقبال سود کے بارے میں کہتے ہیں کہ: ؎

از ربا آخر چہ می زاید فتن!
کس نہ داند لذتِ قرضِ حسن

کہ یہ سود تو اُمّ الخبائث ہے اور اس کے بطن سے تو خبائث ہی وجود میں آئیں گے۔ جبکہ قرضِ حسنہ ایک نعمت ہے اور اس کے اندر لذت ہے‘ جس سے آج کوئی واقف ہی نہیں۔ اور: ؎

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

یعنی اس سود کے ذریعے سے انسان کا باطن تاریک ہو جاتا ہے اور دل اینٹ اور پتھر کی مانند سخت ہو جاتا ہے۔ اب وہ انسان نما بھیڑیا ہے‘ اگرچہ بھیڑیے کی طرح اس کے دانت اور پنجے نہیں ہیں مگر وہ ایک طرح کا درندہ ہے۔

خود معمارِ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے سٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اب آپ کو اسلام کا نظامِ معیشت تیار کرنا ہے‘ اس مغربی نظام معیشت نے انسان کو کوئی خیر اور بھلائی عطا نہیں کی۔

بینکنگ کے نظام کی جو تلخ ترین حقیقت ہے اس تک علامہ اقبال کی نگاہِ تیز پہنچ گئی تھی اور انہوں نے کہہ دیا تھا: ؎

ایں بنوک ایں فکرِ چالاکِ یہود
نورِ حق از سینۂ آدم ربود

کہ یہ بینکاری یہودیوں کے چالاک اور عیار ذہن کی پیداوار ہے اور اس نے انسان کے سینے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ نور کو نکال باہر کیا ہے۔ یہودیوں نے انگلینڈ میں پہلا بینک ’’بینک آف انگلینڈ‘‘ قائم کیا۔ اس سے پہلے یورپ میں بھی سود کی ممانعت تھی۔ جب تک پوپ کا اقتدار قائم تھا سود وہاں جائز نہیں تھا اور کمرشل اور مہاجنی (usury) دونوں طرح کے سود کی وہاں ممانعت تھی۔ لیکن یہودیوں نے عیسائیت کے ٹکڑے کیے اور پروٹسٹنٹ مذہب پیدا کیا‘ جس کا مرکز انگلستان بنا اور وہاں پہلا پروٹسٹنٹ چرچ ’’چرچ آف انگلینڈ‘‘ قائم ہوا۔ پروٹسٹنٹس نے پوپ کے خلاف بغاوت کی اور اس طرح یہودیوں نے پورے یورپ کو اپنے تسلط میں لے لیا۔ علامہ اقبال نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء کے دوران

اپنی نگاہِ حقیقت بین سے یورپ کا مشاہدہ کیا اور اس حقیقت تک پہنچ گئے کہ: ع ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے!''

بینکنگ کے اس نظام کے بارے میں اقبال مزید فرماتے ہیں: ؎

تا تہہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

کہ جب تک بینکنگ کا یہ نظام ملیامیٹ نہیں ہو جاتا تب تک کہاں کی دانش' کہاں کی تہذیب اور کہاں کا دین؟ آپ کے علم میں ہوگا کہ اقبال کی پہلی تصنیف اقتصادیات پر تھی۔ وہ فلسفی' حکیم اور دانا انسان اس معاشی مسئلے کو بھی خوب جانتا تھا۔

اسی طرح یہاں پر غیر حاضر زمینداری (absentee landlordism) کا نظام قائم ہے۔ یہ دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے۔ دورِ بنواُمیہ میں جو جاگیریں دی گئی تھیں' اسلام کے مجددِ اوّل عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے سارے وثائق اور دستاویزات منگوا کر انہیں قینچی کے ساتھ کتر کر پھینک دیا تھا اور سب زمینداریاں اور جاگیرداریاں ختم کر دی تھیں۔ یہ پہلا تجدیدی کارنامہ تھا جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے سرانجام دیا۔ اس کے علاوہ تو ابھی وہاں کوئی خرابیاں آئی ہی نہیں تھیں' نہ غلط عقائد آئے تھے اور نہ کوئی غلط قسم کے فلسفے۔

اس کے بعد ہمارے ائمۂ اربعہ میں سے چوٹی کے دو ائمہ' اصحاب روایت کے گلِ سرسبد امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اصحاب درایت کے سربراہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ' دونوں کے نزدیک مزارعت حرام مطلق ہے۔ اس موضوع پر ہم نے مولانا محمد طاسین صاحب کی کتاب ''مروّجہ نظامِ زمینداری اور اسلام'' شائع کی تھی جس میں یہ حدیث کم از کم دس طرق سے نقل کی گئی ہے کہ جس کے پاس زمین ہے وہ یا تو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو دے دے' لیکن اس کی پیداوار میں سے وہ ایک دانہ بھی لینے کا روادار نہیں ہوگا۔ یہ مزارعت تو ظالمانہ نظام ہے۔ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے پاکستان میں نظر دوڑا کر دیکھئے کہ کہاں ہے وہ سوشل جسٹس؟ کہاں ہے خلافت راشدہ کے سنہری دَور کا عکس؟ کہاں ہے کفالتِ عامہ کا وہ نظام کہ بچہ پیدا ہو تو اس کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے؟ جاگیردار اور زمیندار ہاری کے خون پسینے کی کمائی پر عیش کرتا ہے۔ ان کے اپنے بچے انگلستان اور امریکہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں' جبکہ ہاری کے بچے کو نہ دوا ملتی ہے اور نہ تعلیم کی کوئی سہولت میسر ہے۔

مغرب کے تعلیمی نظام کے ذریعے جو تہذیبی یلغار آئی تھی وہ ابھی تک تو صرف اونچے طبقات مثلاً سول اور ملٹری بیوروکریسی تک محدود تھی کہ ان کی نشست و برخاست اور وضع قطع وغیرہ مغربی تھی' مگر اب یہ یلغار وسیع پیمانے پر آ رہی ہے' بلکہ اب تو ہمارے اوپر دوطرفہ یلغار ہو رہی ہے۔ ایک یلغار تو تہذیب کے اعتبار سے مغرب کی طرف سے آ رہی ہے اور اب کھل کر مسلمانوں کی تہذیب کو برباد کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اس لیے کہ اب امریکہ زمین پر واحد سپریم طاقت ہے اور اسے کسی کا کوئی خوف نہیں ہے۔ جبکہ دوسری یلغار ہندوستان کی طرف سے آ رہی ہے۔ ان کی طرف سے تعلقات معمول پر لانے (normalization) کی باتیں ہو رہی ہیں اور ہم ان کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ محبت اور دوستی کی پینگیں بڑھائی جا رہی ہیں۔ ہماری تہذیب کے بارے میں سونیا گاندھی نے تو بہت پہلے یہ بات کہی تھی:

"We have already conquered Pakistan culturally. Go and see the video shops of Karachi, they are full of the videos of Indian films."

پچھلے دنوں اخبار میں ایک کالم چھپا تھا۔ کالم نگار لکھتا ہے کہ میرے ایک دوست اپنے دوست کی والدہ کے انتقال پر تعزیت کے لیے گئے۔ وہ دوست بہت رو رہے تھے اور وہ انہیں دلاسہ دے رہے تھے کہ اب صبر کرو۔ اُس نے کہا کہ میں صرف اپنی والدہ کے انتقال پر نہیں رو رہا ہوں' بلکہ میں تو اس بات پر رو رہا ہوں کہ میری آٹھ سال کی بچی نے مجھ سے یہ کہا کہ ابا جان ہم اپنی دادی اماں کی ارتھی کو آگ کب لگائیں گے؟ یہ ہے آپ کی نئی نسل جو ہندوستانی فلمیں دیکھ کر ان کی تہذیب اور تمدن سے آشنا ہو رہی ہے۔

نظریۂ پاکستان سے انحراف کے نتائج

یہ صورتِ حال درحقیقت اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے وعدے سے عظیم انحراف کا نتیجہ

ہے۔ہم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا تھا کہ اے پروردگار! اگر تو ہمیں آزادی کی نعمت عطا کر دے تو ہم تیرے دین کا بول بالا کریں گے۔ ہمارے قائد نے دس برس تک اسلام کی قوالی گائی‘ اسلام کے راگ الاپے۔لیکن ہم نے ان کے رخصت ہونے کے بعد اس وعدے سے انحراف کیا اور اس انحراف کا نتیجہ نفاق کی صورت میں نکلا ہے۔ میں نے ''نفاق'' کا لفظ سورۃ التوبۃ کی تین آیات ۷۵ تا ۷۷ کے حوالے سے استعمال کیا ہے۔ان آیات میں مدینہ کے منافقین کی ایک خاص قسم کا ذکر ہورہا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنۡ اٰتٰـنَا مِنۡ فَضۡلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ۝ فَلَمَّاۤ اٰتٰهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ بَخِلُوۡا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ۝ فَاَعۡقَبَهُمۡ نِفَاقًا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ يَلۡقَوۡنَهٗ بِمَاۤ اَخۡلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوۡهُ وَبِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ۝﴾

''ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے نواز دے گا (غنی کر دے گا) تو ہم لازماً صدقہ خیرات کریں گے اور نیک بن کر رہیں گے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا تو انہوں نے اب بخل سے کام لیا اور پیٹھ موڑ لی اور وہ تھے ہی پھر جانے والے۔ تو (نتیجہ یہ نکلا کہ) ان کی اس بدعہدی کی وجہ سے جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کی‘ اور اس جھوٹ کی وجہ سے جو وہ بولتے رہے اللہ نے ان کے دلوں میں نفاق بٹھا دیا جو اُس کے حضور ان کی پیشی کے دن تک ان کا پیچھا نہ چھوڑے گا''۔

تو یہ وہ سزا ہے جو آج اُمت مسلمہ پاکستان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جا چکی ہے۔ نفاق وہ چیز ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے: ﴿اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ فِى الدَّرۡكِ الۡاَسۡفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (النساء:۱۴۵) ''یقیناً منافق تو جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے''۔

اب میں تین قسم کے نفاق کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ پہلا نفاق ''نفاق باہمی'' ہے۔ ہم ایک قوم ہوتے تھے لیکن اب قومیتوں میں تحلیل ہو چکے ہیں۔ اب تو عصبیتیں ہی عصبیتیں ہیں‘ صوبائی عصبیتیں ہیں‘ علاقائی عصبیتیں ہیں‘ لسانی عصبیتیں ہیں۔ پھر مذہبی اختلافات ہیں۔ ۱۹۷۱ء میں ملکِ خداداد پاکستان دولخت ہوا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کی عظیم ترین ہزیمت تھی۔ اندرا گاندھی نے اس موقع پر کہا تھا:

"We have avenged our thousand years defeat."

کہ ہم نے اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکا دیا ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم نے دو قومی نظریے کو خلیج بنگال کے اندر غرق کر دیا ہے۔ ہمارے ۹۳ ہزار فوجی ہندوؤں کے قیدی بنے اور ہمارا سارا اسلحہ ان کے ہاتھ لگا۔ اُس وقت ہمارا مورال پاتال کو پہنچ چکا تھا۔ پاکستان اُسی وقت ختم ہوسکتا تھا‘ اس لیے کہ مغربی پاکستان میں بھی ہمارا دفاعی نظام بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ سیالکوٹ سیکٹر اور راجستھان سیکٹر ٹوٹ چکے تھے۔ صرف ایک جنرل ٹکا خان سلیمانکی ہیڈورکس پر اپنی ٹاسک فورس لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ ہماری فضائیہ مفلوج ہو چکی تھی۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ابھی مزید مہلت دینی تھی لہٰذا نکسن کی کوششوں سے جنگ بندی ہوگئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں چھوٹا عذاب دکھا کر بڑا عذاب فی الحال ٹال دیا۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَلَنُذِيۡقَنَّهُمۡ مِّنَ الۡعَذَابِ الۡاَدۡنٰى دُوۡنَ الۡعَذَابِ الۡاَكۡبَرِ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ۝﴾ (السجدۃ) ''اور لازماً ہم انہیں بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذاب کا مزا چکھائیں گے شاید کہ وہ لوٹ آئیں''۔ اگرچہ یہ عذاب بہت بڑا تھا لیکن اس اعتبار سے ادنیٰ تھا کہ بہرحال مشرقی پاکستان کے نام سے نہ سہی بنگلہ دیش کے نام سے ہی سہی‘ ایک آزاد مسلمان ملک اب بھی موجود ہے۔ اس کی ماہیت بدل گئی ہے لیکن اب بھی وہاں پر مسلمان حکومت تو ہے۔ بہرحال اُس وقت پاکستان ختم ہونے سے بچ گیا تھا لیکن اب اس کے حصے بخرے ہونے (balkanization) کی خبریں آ رہی ہیں۔

۱۹۹۲ء میں ایک مسلمان مصنف ابوالمعالی سید نے "Twin Eras of Pakistan" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو نیویارک سے چھپی تھی۔ یہ شخص بہار میں پیدا ہوا تھا‘ تقسیم ہند کے وقت مشرقی پاکستان چلا گیا تھا‘ پھر مغربی پاکستان آ گیا۔ کراچی سے ایم اے کیا اور پھر جا کر مغربی یونیورسٹیوں سے کئی پی ایچ ڈیز کیں۔ اس نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ ۲۰۰۶ء تک پاکستان چھ سات ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا ہوگا۔ ۲۰۰۶ء تک اللہ کے فضل سے ایسا نہیں ہوا ہے ـــــ لیکن ع ''سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا!'' دنیا

اس ملک کے بارے میں کیا سوچ رہی ہے! رینڈ کارپوریشن کی پیشین گوئی ہے کہ ۲۰۲۰ء میں پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشے پر کوئی ملک نہیں ہوگا۔ اس وقت حالات تو اسی رخ پر جا رہے ہیں۔ بلوچستان علیحدگی کے دہانے پر کھڑا ہے۔ ۱۹۸۳ء میں ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران جب ضیاء الحق کی حکومت تھی، سندھو دیش بھی بن سکتا تھا۔ علیحدگی پسند ریلوے لائن کے سلیپرز کو آگ لگا رہے تھے۔ وہ تو اندرا گاندھی اُس وقت چوک گئی کہ ان کو مدد فراہم نہ کی، ورنہ وہ ریلوے لائن اور سڑک کا رابطہ منقطع کر سکتے تھے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے ابھی تک مہلت دے رکھی ہے اور اس مہلت کی قدر کی جانی چاہیے۔ اور یہ نہ سمجھئے گا کہ پنجاب میں صوبائی عصبیت نہیں ہے۔ پنجاب میں شدید ترین صوبائی عصبیت موجود ہے، جس کی وجہ سے پنجاب کی مزید تقسیم نہیں ہوسکی۔ حالانکہ پاکستان میں ہر سوچنے سمجھنے والے شخص نے یہ کہا کہ پنجاب کو تقسیم ہونا چاہیے تاکہ ملک میں ایک ہموار قسم کا فیڈرل نظام بن سکے۔ یہ صوبہ اتنا بڑا ہے کہ باقی تینوں صوبوں کی آبادی سے بھی اس کی آبادی زیادہ ہے۔ لیکن کوئی سننے کو تیار نہیں ہے۔

دوسرا نفاق "عملی نفاق" ہے کہ ہمارے اخلاق کا دیوالیہ نکل گیا ہے۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں وارد حدیث نبویؐ ہے کہ "منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے"۔ دوسری حدیث میں ایک چوتھی نشانی بھی ہے کہ "اگر جھگڑا ہو جائے تو فوراً آپے سے باہر ہو جائے"۔ اب ان چار علامات کے حوالے سے اپنے معاشرے کا جائزہ لے لیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ جو جتنا بڑا ہے اتنا ہی جھوٹا ہے، جو جتنا بڑا ہے اتنا ہی وعدہ خلاف اور اتنا ہی بڑا خائن ہے۔ یہاں اربوں اور کھربوں کے غبن ہوئے ہیں، ہمارے اعلیٰ افسروں نے ڈاکو بن کر اس ملک کو لوٹا ہے۔ لڑائی جھگڑے اور قتل و غارت روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ دو آدمی ذرا سا جھگڑیں تو فوراً چاقو یا پستول نکل آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جان کی قدر و قیمت مکھی کی جان سے زیادہ نہیں ہے۔

تیسرا اور سب سے بڑا نفاق ہمارے ہاں دستور کا نفاق ہے۔ کسی ملک میں اہم ترین دستاویز اس کا دستور ہوتا ہے۔ میں معذرت کے ساتھ یہ الفاظ استعمال کر رہا ہوں کہ پاکستان کا دستور منافقت کا پلندا ہے۔ منافق وہی ہوتا ہے نا جو ظاہر میں مسلمان ہو اور باطن میں کافر! اور پاکستان کے دستور کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے قرارداد مقاصد بھی کافی تھی، اگر اس میں ایک جملے کا اضافہ کر دیا جاتا کہ یہ بقیہ تمام دستور پر حاوی ہوگی۔ جسٹس نسیم حسن شاہ نے اس قرارداد مقاصد کو ٹھوکر مار کر ردّ کر دیا کہ اس آرٹیکل کا دوسرے آرٹیکلز کے اوپر کوئی اثر نہیں ہوسکتا اور بات ختم ہوگئی۔ دفعہ ۲۲۷ کے بڑے خوبصورت الفاظ ہیں:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."

لیکن اسے اسلامی نظریاتی کونسل کے ساتھ نتھی کر دیا گیا۔ اس کونسل پر کروڑوں روپیہ صرف ہوا اور ان لوگوں نے بڑی محنت سے اچھی سے اچھی رپورٹیں تیار کیں، لیکن وہ رپورٹیں مختلف وزارتوں کے دفاتر میں جا کر dump ہوگئیں، کوئی وزارتِ مالیات کی الماریوں میں ہیں، کوئی وزارتِ داخلہ کی الماریوں میں ہیں اور آج تک کسی ایک پر بھی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

ضیاء الحق صاحب نے فیڈرل شریعت کورٹ بنا کر ایک کارنامہ انجام دیا۔ اصولی اعتبار سے اسلام کے نفاذ کا یہ بہترین طریقہ ہے کہ ایک اعلیٰ عدالت ہو جسے یہ اختیار ہو کہ اگر وہ کسی شے کو قرآن وسنت کے خلاف پائے تو وہ فتویٰ دے دے کہ یہ خلافِ اسلام ہے۔ وہ اگر مرکزی حکومت کے دائرے کی چیز ہے تو اس کو نوٹس چلا جائے کہ اتنے مہینے کے اندر اندر اس کو ختم کر دو اور اس کی جگہ اسلام کے مطابق کوئی چیز رائج کرو، ورنہ یہ کالعدم ہو جائے گی اور ایک خلا پیدا ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر صوبائی حکومت کا معاملہ ہے تو اس کو نوٹس جاری کر دیا جائے۔ لیکن اس فیڈرل شریعت کورٹ کو دو ہتھ کڑیاں اور دو بیڑیاں ڈال دی گئیں کہ: (۱) دستورِ پاکستان اس کے دائرۂ اختیار سے خارج ہے۔ گویا ہم دستور کے معاملے میں اسلام کی کوئی رہنمائی قبول کرنے کو تیار نہیں۔ (۲) عدلیہ کے طریق کار سے

متعلق قوانین، ضابطہ دیوانی، ضابطۂ فوجداری اس کے دائرۂ کار سے خارج ہیں۔ (۳) دس سال تک مالی معاملات اس کے دائرہ کار سے خارج ہوں گے۔ (۴) عائلی قوانین بھی اس کے دائرۂ اختیار سے خارج کر دیے گئے جو ایک منکرِ حدیث غلام احمد پرویز نے ایک فوجی ڈکٹیٹر ایوب خان سے بنوائے تھے اور آج تک چلے آ رہے ہیں۔ ضیاء الحق صاحب گیارہ برس تک اسلام اسلام کرتے ہوئے چلے گئے لیکن وہ قوانین جوں کے توں موجود رہے۔

میں نے ضیاء الحق صاحب کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کوشش کی تھی، لیکن ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ انہوں نے مجھے مرکزی وزارت کی پیشکش کی تھی تو میں نے اُن سے کہا کہ ایک تو میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ دوسرے یہ کہ آپ نے ہمیں کوئی کام کرنے نہیں دینا، آپ کی تو فوجی حکومت ہے اور الزام ہم پر آئے گا کہ یہ نکمے ہیں۔ جیسے پہلی وزارتوں میں جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام کے جو وزراء بنے تھے ان کو داغ دار کر کے وہاں سے نکال باہر کیا گیا تھا کہ یہ نکمے لوگ ہیں، کچھ کر نہیں سکے۔ تاہم جب انہوں نے مجھے مجلس شوریٰ میں شمولیت کی دعوت دی تو وہ میں نے اس خیال سے قبول کر لی کہ یہ واقعی اسلام کا کچھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن دو سیشنز کے اندر ہی میں نے سمجھ لیا کہ ان کا کچھ کرنے کا ارادہ نہیں ہے، یہ تو بس امریکی رائے عامہ کو یہ دکھانے کے لیے ہے کہ میری حکومت خالص فوجی حکومت نہیں ہے، بلکہ سول نمائندے بھی میرے ساتھ ہیں۔

۵؍جولائی ۱۹۸۲ء کو گورنر ہاؤس لاہور میں میری اُن سے ملاقات ہوئی اور میں نے کہا جنرل صاحب! آپ اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لیے پھر رہے ہیں کہ آپ نے فیڈرل شریعت کورٹ بنائی اور خود اپنے منتخب کردہ علماء کو وہاں جج بنایا، تو کیا آپ کو ان کے فہم، علم اور دیانت پر اعتماد نہیں ہے؟ کہنے لگے کیوں نہیں؟ میں نے کہا پھر آپ نے ان کے ہاتھ کیوں باندھ دیے ہیں کہ فیملی لاز پر بھی وہ بات نہیں کر سکتے! آپ نے مالی معاملات میں دس سال کی قید لگائی ہے، اس کے لیے یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ مالیاتی نظام میں ایک دم تبدیلی نہیں آ سکتی، لیکن ہمارے فیملی لاز کو تو انگریز نے بھی نہیں چھیڑا، یہ ہمارے اپنے علماء کے فتووں کے مطابق چلتے رہے۔ اسی طرح ہندوستان میں مسلمانوں نے آج تک ان میں کوئی مداخلت گوارا نہیں کی، حالانکہ وہاں پر بی جے پی حکومت کا بڑا اہم حصہ رہی ہے اور ''کامن سول کوڈ'' ان کے منشور کا حصہ تھا، یعنی عائلی قوانین سب کے لیے یکساں ہونے چاہئیں۔ لیکن آج تک وہاں پر مسلمانوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ میں نے کہا آپ نے جو عدالت بنائی اور جو علماء بٹھائے ہیں ان کے ہاتھ کھول دیں، اور اگر غلام احمد پرویز بھی عدالت میں جا کر ثابت کر دیں کہ ان میں کوئی چیز کتاب وسنت کے منافی نہیں ہے تو میں خوش، میرا ربّ خوش! کہنے لگے پھر ان خواتین کو کون مطمئن کرے گا؟ میں نے کہا کہ اگر آپ کی سوچ کا یہی معیار ہے تو یہ میرا استعفاء حاضر ہے۔

دس سال کی مدت گزرنے کے بعد وفاقی شرعی عدالت نے بڑا معرکۃ الآراء فیصلہ کیا کہ بینک انٹرسٹ کو سود قرار دے دیا۔ لیکن حکومت کی طرف سے ایک اپیل دائر کروا دی گئی، پھر مہلت لی گئی، پھر جسٹس تقی عثمانی صاحب کو وہاں سے نکال باہر کیا گیا جو لوہے کا چنا تھے اور دو نئے جج لائے گئے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان سے پہلے ہی یہ بات طے ہو گئی تھی کہ انہوں نے یہی کہنا ہے کہ بینک انٹرسٹ ابھی تک سود ثابت نہیں ہوا، لہٰذا شریعت کورٹ ازسرِ نو اس پر غور کرے۔

اس اعتبار سے اب جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ بہت کڑوی ہے کہ پاکستان اپنا جواز کھو رہا ہے۔ بیرسٹر فاروق حسن کی یہ بات ابھی میرے سامنے آئی ہے، اور یہ کتنی بڑی بات ہے کہ بھارت پاکستانیوں سے پوچھ رہا ہے کہ تم نے پاکستان کس لیے بنایا ہے؟ وہاں کیا ہے جو یہاں نہیں ہے؟ بلکہ وہ اس اعتبار سے بہتر رہے کہ انہوں نے جاگیرداریاں تو ختم کر دیں اور وہاں عوامی سیاست ہے۔ جبکہ پاکستان میں تو جاگیردار بیٹھا ہے اور کتنا ہی شفاف الیکشن ہو ساٹھ ستر فیصد تو وہی جاگیردار ہی منتخب ہوتے ہیں، باپ نہیں تو بیٹا اور چچا نہیں تو بھتیجا، اللہ اللہ خیر صلا۔ پاکستان کی سیاست تو میوزیکل چیئرز گیم ہے، جاگیرداروں کا ایک مشغلہ ہے۔ اس اعتبار سے فرنچ زبان کا ایک لفظ ہے جسے انگریزی میں ایسے پڑھتے ہیں: ''raison d'etre''، یعنی کسی چیز کا جواز کہ یہ کیوں ہے؟ پاکستان اپنا جواز کھو رہا ہے، اس لیے کہ یہاں اس نظام کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی جس کے لیے یہ پاکستان بنا۔ حالانکہ قائداعظم

نے ۱۰ برس تک اسلام ہی کی بات کی جس کی وجہ سے مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت کا مقام حاصل ہوا۔ ایک تو یہ کہ پاکستان کی جو مثبت اساس تھی یعنی اسلام اور دورِ خلافتِ راشدہ کو دوبارہ لانے کا اہتمام‘ اس کی طرف کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی۔ دوسرے یہ کہ امریکہ کے دباؤ کے تحت بھارت کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ بھارت کا موقف ہمیشہ سے یہ تھا کہ پہلے normalization کرو‘ پھر کشمیر کی بات کرو‘ لیکن ہم نے کہا نہیں‘ پہلے کشمیر پھر کوئی اور بات۔ خود ہمارے موجودہ صدر یہ کہہ کر آگرہ سے واپس آ گئے تھے کہ پہلے کشمیر کی بات ہوگی‘ پھر اور کوئی بات ہوگی۔ لیکن اب کیا ہو رہا ہے کہ آمد و رفت ہے‘ ایک دوسرے کو سینے سے لگایا جا رہا ہے‘ بسنت منائی جا رہی ہے۔ اور صورت حال یہ ہو چکی ہے کہ مشرقی پنجاب کا وزیر اعلیٰ دو دفعہ لاہور میں آ کر کہہ گیا ہے کہ یہ لکیر مصنوعی ہے‘ اسے ختم ہونا چاہیے اور مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کو ایک ہی ہو جانا چاہیے۔ کسی اور ملک میں کبھی ایسی بات نہیں ہوتی۔ ایل کے ایڈوانی پاکستان آیا اور اس نے قائد اعظم کے مزار پر جا کر تو پھول چڑھا دیے‘ لیکن ساتھ یہ بھی کہہ گیا کہ اب تو بس کنفیڈریشن ہو جانی چاہیے۔

اب یہ جو محبت کے ترانے گائے جا رہے ہیں اور طائفے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آ رہے ہیں اس سے پاکستان کے وجود کا منفی محرک بھی ختم ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں جمہوریت کے ساتھ ساتھ سیکولرزم بھی ہے اور وہاں پر پہلے جیسی مذہبی دشمنی نہیں ہے‘ لیکن اس بات کو فراموش مت کیجیے کہ ہر ہندو کے دل میں پاکستان کا ایک زخم ہے۔ کوئی ہندو کتنا ہی روادار ہو‘ کتنی ہی میٹھی میٹھی باتیں کرے‘ لیکن اس کے دل کا ناسور یہی ہے کہ پاکستان تو بھارت ماتا کے ٹکڑے کر کے بنایا گیا ہے۔ لہٰذا انہیں کوئی بھی موقع ملا تو وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں ذرا تأمل نہیں کریں گے۔ جیسے ۱۹۷۱ء میں سبرامنیم نے حکومت کو رپورٹ لکھی کہ ایسا موقع تو صدیوں بعد ہاتھ آتا ہے۔ اسے ضائع مت کریں!:

(This is the chance of centuries, use it!)

بہر حال تعلقات کو معمول پر لانے کا عمل اگر اس کے بعد ہوتا کہ ہم اپنی نظریاتی اساس کو مضبوط کر چکے ہوتے تو یہ خوش آئند بات تھی۔ محبت‘ خیر سگالی اور اچھے تعلقات کو کون برا کہے گا؟ آمد و رفت ضرور ہونی چاہیے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں مفید ہوتا اگر ہماری نظریاتی اساس مضبوط ہوتی۔ بلکہ پھر تو محبت اور امن کا قدم ہماری طرف سے اٹھتا‘ پھر ہم داعی ہوتے۔ دنیا میں جہاں بھی اسلام کا نظام قائم ہوگا اُس کی حیثیت پوری دنیا کے لیے داعی کی ہوگی کہ یہ نظام اختیار کیا جائے۔ یہ ہمارے باپ کی جاگیر نہیں ہے‘ یہ رحمۃٌ للعالمین ﷺ کا دیا ہوا نظام ہے‘ یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے رحمت ہے۔ لیکن اِن حالات میں تو اس سب کچھ کا مطلب پاکستان کی نفی (negation) ہے۔

اِس وقت جو آخری صلیبی جنگ شروع ہو چکی ہے‘ جس کا میدان افغانستان بنا ہوا ہے اس کے تھپیڑے اب پاکستان کے اندر آ چکے ہیں۔ صدر پرویز مشرف کے لیے بڑا سخت وقت آنے والا ہے۔ ان سے کہا جا رہا ہے ابھی اور کچھ کرو (Do more!)‘ اگر تم نہیں کرو گے تو ہم خود کریں گے۔ چنانچہ امریکی ایوان نمائندگان میں ایک جنرل اپنی تقریر میں یہ بات کہہ چکا ہے کہ ہمیں پاکستانی علاقے پر حملے کرنے چاہئیں۔ اِدھر مشرقی سرحد کے اوپر ہمارا ازلی دشمن بیٹھا ہے‘ جب موقع ملے گا وہ اس لکیر کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا‘ اور ہماری مغربی سرحد بھی محفوظ نہیں رہی۔ افغانستان کی حکومت شروع سے پاکستان کی مخالف تھی۔ پاکستان کے اقوام متحدہ تنظیم کا ممبر بننے کی تجویز کی صرف افغانستان نے مخالفت کی تھی‘ باقی پوری دنیا نے کہا تھا کہ پاکستان کو اس کا ممبر ہونا چاہیے۔ ایک دور میں جب افغان نیشنلزم پروان چڑھ رہا تھا اور ہمارے ہاں پختونستان کے نعرے لگ رہے تھے اُس وقت بعض لیڈر یہ کہہ رہے تھے کہ وہ زنجیر جو طورخم پر لگی ہوئی ہے ہم اسے وہاں سے ہٹا کر اٹک پر لگا دیں گے۔ پھر ایک دور وہ بھی آیا جب افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہوئی۔ اس دور میں پاک افغان تعلقات بہت بہتر ہوئے اور ہماری مغربی سرحد محفوظ ہو گئی۔ ۱۱ ستمبر کے واقعے کے بعد پاکستان نے امریکی دھمکیوں میں آ کر اپنی افغان پالیسی سے یوٹرن لے لیا۔ اب وہاں آخری صلیبی جنگ شروع ہو چکی ہے اور پاکستان میں اس کے تھپیڑے شاید اس لیے آ

رہے ہیں کہ ایک حدیث نبویؐ میں اس علاقے کے بارے میں کہا گیا ہے:

((یَخْرُجُ مِنْ خُرَاسَانَ رَایَاتٌ سُوْدٌ لَا یَرُدُّھَا شَیْءٌ حَتّٰی تُنْصَبَ بِاِیْلِیَاءَ)) (۱)

''خراسان سے سیاہ جھنڈے لے کر فوجیں نکلیں گی' کوئی ان کا رخ نہیں موڑ سکے گا' یہاں تک کہ ایلیاء (بیت المقدس) میں جا کر وہ جھنڈے نصب ہو جائیں گے''۔

گویا حدیث کی رو سے بیت المقدس پر یہودیوں کا قبضہ ہو گا اور خراسان سے فوجیں جا کر اسے واگزار کرائیں گی۔ یہ باتیں یہودی ہم سے زیادہ جانتے ہیں' اس لیے انہوں نے اس علاقے (خراسان) میں آخری صلیبی جنگ (The Last Crusade) کا آغاز کیا ہے۔ واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جو علاقہ خراسان تھا اس میں افغانستان بھی شامل ہے اور پاکستان کا بھی کچھ علاقہ شامل ہے۔ افغانستان کو اس لیے بھی میدانِ جنگ بنایا گیا کہ طالبان نے افغانستان میں اسلامی نظام کی ایک جھلک دکھا دی تھی' اگرچہ پورا اسلامی نظام نہیں تھا' نہ وہاں اسلام کا سیاسی نظام تشکیل پایا تھا نہ معاشی نظام' صرف چند ایک اسلامی سزائیں نافذ کی گئی تھیں اور افغانستان کا نوے فیصد علاقہ جرائم سے پاک ہو گیا تھا۔ لیکن یہودیوں نے اپنے تئیں "Nip the evil in the bud" کے طور پر اسے تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ ہمارے ہاں کے سیکولر دانشوروں میں پسرِ اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال کو بہت نمایاں مقام حاصل ہے۔ وہ طالبان کے زمانے میں کابل میں آٹھ دس دن گزار کر واپس آئے اور جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جو حالات میں وہاں دیکھ کر آیا ہوں اگر چند اور مسلمان ملکوں میں بھی یہی کچھ ہو جائے تو پوری دنیا اسلام لے آئے گی۔ اور یہی وہ بات ہے جو شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو پسند نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت شیطان کے سب سے بڑے ایجنٹ یہودی ہیں اور پوری عیسائی دنیا اِن کی آلۂ کار بنی ہوئی ہے۔ اور یہ بات اب پاکستان کے سامنے بھی کھل کر آ چکی ہے۔

(۱) سنن الترمذی' کتاب الفتن' باب ما جاء فی النھی عن سبّ الریاح۔

دعوتِ فکر

اب اس سب کا حل کیا ہے؟ اس کا حل ہے ''توبہ'' ـــــ سب سے پہلے انفرادی اور اجتماعی توبہ۔ تاریخ میں دو مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ کسی قوم نے اجتماعی توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے اُس کی حالت بدل دی۔ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر عذاب کے آثار شروع ہو چکے تھے' لیکن انہوں نے توبہ کی تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرما لی۔ حالانکہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ عذاب کے آثار شروع ہو جانے کے بعد کوئی قوم توبہ کرے اور اس کی توبہ قبول ہو جائے' لیکن قومِ یونسؑ کے بارے میں کہا گیا: ﴿اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ﴾ ''سوائے قومِ یونس کے''۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یونس علیہ السلام سے خطا ہو گئی تھی کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت آئے بغیر اپنی قوم سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ لہٰذا جب وہاں عذاب کے آثار ظاہر ہوئے اور پوری قوم نے توبہ کی تو عذاب کے آثار ٹل گئے۔ اسی طرح یہودیوں کی تاریخ میں بھی ایسا ہوا ہے۔ یہودی انتہائی پستی میں گر چکے تھے جب بخت نصر کی صورت میں ان پر اللہ کے عذاب کا کوڑا برسا۔ اُس نے چھ لاکھ یہودی بیت المقدس میں قتل کیے تھے اور چھ لاکھ کو وہ قیدی بنا کر لے گیا تھا۔ بیت المقدس میں ایک متنفس بھی باقی نہیں رہا تھا اور ہیکل سلیمانی کی دو اینٹیں بھی سلامت نہیں رہی تھیں۔ پھر حضرت عزیر علیہ السلام نے توبہ کی منادی کی کہ لوگو توبہ کرو' پلٹو اپنے ربّ کی طرف' مشرکانہ اوہام اور بدعات سے توبہ کرو' اللہ تعالیٰ کے فرائض کو ادا کرو اور شریعت کو اپنے اوپر نافذ کرو۔ اس طرح سے ان کی زندگی کے اندر ایک انقلاب آیا اور ان کی ایک عظیم تر حکومت قائم ہوئی جو مکابی سلطنت کہلاتی ہے۔ تو اب بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری توبہ کو قبول فرما لے۔

اب سب سے پہلے ہمیں دعا کرنی چاہیے اور دعا سب سے پہلے صدر مشرف صاحب کے لیے۔ وہ ہمیں پسند ہوں یا نہ ہوں لیکن اس وقت اس ملک کی تقدیر ان کے ہاتھ میں ہے۔ تمام انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں' وہ انہیں جدھر چاہے پھیر دے۔ تو دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ صدر پرویز مشرف کے دل کو بدل دے اور اب امریکہ کی طرف سے کوئی بڑا امتحان آئے تو وہ اس کے سامنے ڈٹ جائیں کہ جو کرنا ہے کر لو' ہمیں

تو پاکستان اور اسلام کی سلامتی عزیز ہے۔ بابر بادشاہ کی مثال موجود ہے کہ جب اس کا رانا سانگا سے مقابلہ ہوا اور اسے شکست کا خطرہ محسوس ہوا تو اس نے توبہ کی' شراب کے برتن توڑے' اللہ کی مدد مانگی' نصرت خداوندی کو پکارا تو اللہ نے فتح دے دی۔ لہٰذا دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ صدر مشرف کے دل کو بھی بدل دے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ پاکستان کے مخلص ہیں' دشمن نہیں ہیں' لیکن اصل بات جو ان کے سامنے نہیں ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان کی جڑ اور بنیاد اسلام کے سوا کوئی نہیں' اور اس کی بقاء اور اس کا استحکام سوائے اسلام کے کسی اور شے سے ممکن نہیں۔ کاش یہ بات اُن کی سمجھ میں آ جائے' اور یہ کوئی ایسی انہونی بات نہیں ہے۔ انسانی شخصیتوں کے اندر بھی انقلاب آ جایا کرتے ہیں۔

دوسری توبہ ہے دستوری سطح پر توبہ۔ پاکستان کے دستور میں جو چور دروازے ہیں جن کی وجہ سے یہ دستور منافقت کا پلندا بنا ہوا ہے' وہ سارے چور دروازے بند کیے جائیں۔ اس کے لیے ہم نے ایک ترمیمی خاکہ بنایا ہے اور اسے بڑے پیمانے پر شائع کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہم متحدہ مجلس عمل کے لوگوں سے بھی ملے ہیں۔ اس سے پہلے جب مسلم لیگ کو نواز شریف صاحب کی قیادت میں ایک بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی اور نواز شریف وزیر اعظم بن گئے تھے تو میں نے ان کے والد گرامی میاں محمد شریف صاحب کو ایک خط لکھا تھا' جس کا کچھ اثر ہوا اور وہ اپنے تینوں بیٹوں نواز شریف' شہباز شریف اور عباس شریف کو لے کر میرے پاس تشریف لائے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ ہم دستور میں یہ ترمیم کریں گے۔ اس کے بعد میاں شریف صاحب بیمار ہو گئے اور علاج کے لیے انگلینڈ چلے گئے۔ پھر جب شفایاب ہو کر واپس آئے تو میں نے اخبار میں اشتہار دے کر انہیں دوبارہ اس طرف متوجہ کیا کہ اپنے وعدے یاد کیجیے! اس کے بعد یہ چاروں حضرات دوبارہ میرے پاس تشریف لائے اور دستوری ترمیم کا وعدہ کیا۔ مزید برآں شہباز شریف نے سود کو ختم کرنے کے لیے تین سال کی مہلت مانگی' لیکن میں نے کہا یہ ایک سال کے اندر اندر ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس پر میاں محمد شریف صاحب نے کہا کہ نہیں' یہ صرف چھ ماہ کے اندر ختم کیا جائے۔ لیکن وہ سارے وعدے ہوا ہو گئے۔ اس کے بعد پندرھویں ترمیم کا خاکہ آیا بھی تو وہ ایک انتہائی نامعقول چیز تھی۔ بہرحال ہم اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ دستور میں وہ ترمیم ہو جائے جس کا ہم نے خاکہ بنایا تھی۔ اُس وقت جنرل حمید گل صاحب نے کہا تھا کہ اگر اس پر عمل ہو جائے تو پاکستان میں ایک soft revolution آ جائے گا۔ پاکستان کے دستور میں خلافت کی جڑ بنیاد موجود ہے' صرف کچھ دفعات نے اس کو غیر مؤثر کر دیا ہے' ان دفعات کا معاملہ اگر درست ہو جائے' ان کی اصلاح ہو جائے تو یہ دستور خلافت کا بہترین دستور بن جائے گا۔

تیسری بات یہ کہ اگر یہ soft revolution نہیں آتا تو ہمیں hard revolution کی تیاری کرنی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں تبدیلی لائیں۔ معصیت کو ترک کریں' اپنی معاشرت اور معاش سے حرام چیزوں کو نکال باہر کریں۔ فرائض کی ادائیگی میں جو کوتاہی ہے اس کی تلافی کریں۔ اس انفرادی توبہ کے بعد مل جل کر ایک حزب اللہ بنائیں۔ یہ قرآن کی اصطلاح ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ط اَلَا اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٢٢﴾﴾ (المجادلۃ) ''یہی لوگ اللہ کی جماعت ہیں' آگاہ رہو اللہ کی جماعت ہی کامیاب ہونے والی ہے''۔ ہم نے اس حزب اللہ کے حوالے سے تنظیم اسلامی بنائی ہے اور یہ بیعت سمع وطاعت فی المعروف کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص ہماری جماعت کے ساتھ متفق نہیں ہے تو کوئی بات نہیں' لیکن اللہ کے حضور میں توبہ تو ہر شخص کو کرنی چاہیے۔ اور انفرادی توبہ کے بعد ہر شخص طے کر لے کہ وہ کسی نہ کسی ایسی جماعت میں ضرور شامل ہو گا جو پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ کوئی شخص بھی اس جدوجہد سے خالی نہ رہے۔

اگر حزب اللہ طرز کی ایک جماعت معتد بہ تعداد میں تیار ہو جائے تو وہ ایک پرامن عوامی احتجاجی تحریک شروع کرے۔ یہ تحریک کسی کو نقصان نہ پہنچائے' کوئی توڑ پھوڑ نہ کرے' لیکن اپنی جانیں دینے کے لیے تیار ہو جائے۔ جیسے تہران کے اندر ایرانیوں پر فائرنگ ہوئی اور ہزاروں ایرانی جاں بحق ہوئے تو پھر بادشاہ کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔ عوامی سیلاب کا ریلا جب آتا ہے تو نیشنل آرمی حکومت کا حکم مان کر فائرنگ تو کرتی ہے' لیکن پھر ایک وقت آتا

ہے کہ ہاتھ اٹھا دیتی ہے۔ پاکستان میں جب قومی اتحاد کی بھٹو مخالف تحریک چل رہی تھی تو اس میں بہت سے لوگوں نے جانیں دیں۔ لیکن پھر بریگیڈیئر محمد اشرف گوندل نے لاہور میں کہا کہ اب ہم مزید فائرنگ نہیں کریں گے۔ ایسے ہی دو بریگیڈیئر اور کھڑے ہو گئے تو بھٹو صاحب کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ چند دن پہلے جو انہوں نے کہا تھا کہ ''میری کرسی بہت مضبوط ہے'' تو انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ کرسی تو مضبوط نہیں ہے' یہ تو محض فوج کے بل پر قائم تھی۔

اسی طرح یوکرائن' جارجیا' کرغیزستان اور لاطینی امریکہ میں جو کچھ ہوا وہ اس کی مثالیں ہیں۔ یہ یک طرفہ مسلح بغاوت نہیں بلکہ ایک پرامن منظم اور مضبوط جماعت کے زیر قیادت مطالبہ ہے کہ یہ چیزیں ختم کرو۔ تو اس طرح کی ایک عوامی تحریک کے ذریعے سے تبدیلی لانا گویا ایک hard revolution ہوگا۔ اس کے لیے ہماری تنظیم اسلامی بھی ہے اور تحریک خلافت بھی۔ اس مقصد کے لیے اور جماعتیں بھی کام کر رہی ہیں۔ میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ اس مقصد کے لیے قائم کی گئی جماعتوں کا تقابلی مطالعہ کریں اور جس جماعت پر آپ کا دل مطمئن ہو جائے کہ یہ اسلام کے لیے اور اسلامی انقلاب کے لیے صحیح کام کر رہی ہے تو اس میں شامل ہو جائیں۔ لیکن اس جدوجہد سے آزاد کوئی شخص نہ رہے۔

ہماری ایک تنظیم اسلامی ہے اور ایک تحریک خلافت ہے۔ بعض لوگ اس میں ذرا اُلجھ جاتے ہیں کہ یہ دو تنظیمیں کیوں ہیں۔ تو مثال کے طور پر دیکھئے کہ ایک تحریک پاکستان تھی' لیکن جو جماعت اس کی علمبردار تھی اس کا نام مسلم لیگ تھا۔ اسی طرح ہماری ایک تحریک خلافت ہے اور جو جماعت اس کی علمبردار ہے اُس کا نام تنظیم اسلامی ہے۔ خلافت کے قیام کی خوشخبری دی ہے محمد رسول اللہ ﷺ نے کہ قیامت سے پہلے پوری دنیا میں نظام ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' قائم ہوگا' اور ہمیں پختہ یقین ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ اس میں کسی کو بھی شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے' یہ خوشخبری صحیح اور پختہ احادیث کے اندر موجود ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ نظامِ خلافت کسی ایک ملک سے شروع ہوگا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مشیت خداوندی بہت عرصے سے اس خطے کے لیے کوئی فیصلہ کر چکی ہے۔ اس لیے کہ تحریک خلافت چلی تو یہاں ہندوستان میں' اور کہیں بھی نہیں چلی۔ آزادی کی تحریکیں چلیں تو دوسرے ملکوں میں تو اپنے لوکل نیشنلزم کی بنیاد پر چلیں' لیکن یہاں پر اسلام کے نام پر تحریک چلی۔ پاکستان معجزے کے طور پر قائم ہوا اور رمضان المبارک کی ۲۷ ویں شب کو گویا اللہ کی طرف سے نازل ہوا۔ اسی طرح مجددین کا سلسلہ جو ایک ہزار برس تک عالمِ عرب میں رہا تھا' وہ ہندوستان میں منتقل ہوا۔ یہ وہ آیات اور کرامات ہیں جو پاکستان کے ساتھ وابستہ ہیں۔

اس کے بعد بھی اگر خدانخواستہ پاکستان ناکام ہو جاتا ہے تو جان لیجیے کہ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (محمد:۲۸) ''اور اگر تم نے پیٹھ موڑ لی تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا''۔ یعنی جو مشن ہم نے تمہارے حوالے کیا ہے تم نے اگر اس سے روگردانی کی تو ہم تمہیں ہٹائیں گے اور یہی مشن کسی اور کے حوالے کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس وقت سے ہمیں بچائے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اسلام کے سپاہی بنیں اور یہاں اسلام کو قائم کرنے کی جدوجہد میں اپنا تن من دھن لگانے کے لیے تیار ہو جائیں! ورنہ ہمارا حشر وہ ہوگا جس کی مثال سورۃ الاعراف میں بلعم بن باعورہ کی دی گئی ہے —— اور پھر صورت یہ ہوگی کہ ع: ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!'' ——

اعاذنا الله من ذلك!!

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

(ترتیب وتسوید: حافظ خالد محمود خضر' طارق اسماعیل ملک)

ضمیمہ

قائداعظم مرحوم: شرافت ومروت کے پیکر

اور ان کے آخری کلمات:

پاکستان کی منزل ''نظامِ خلافت راشدہ''

قائداعظم کے معالج ڈاکٹر ریاض علی شاہ

پروفیسر آف امراض ٹی بی، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور

قیام پاکستان کے ٹھیک ایک سال بعد قائداعظم انتہائی علالت کے عالم میں، زیارت ریذیڈنسی میں، گویا بستر مرگ پر اپنی زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے تو ان کا علاج کرنل الٰہی بخش اور ڈاکٹر ریاض علی شاہ پوری توجہ اور جانفشانی سے کر رہے تھے۔ دونوں معالجوں نے بعد میں اپنی یادداشتیں بھی تحریر کی ہیں۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ کی یادداشت کا ایک اقتباس روزنامہ ''جنگ'' نے اپنی ۱۱ر ستمبر ۱۹۸۸ء کی ایک خصوصی اشاعت میں شائع کیا تھا، جس میں قائداعظم نے پاکستان کے مستقبل کا پورا خاکہ اہلِ پاکستان کے سامنے رکھ دیا ہے:

میرے لئے یہ بات حیرت کا باعث تھی کہ لاہور سے زیارت تک کا سفر طے کر کے میں شدید بیماری میں مبتلا قائداعظم کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کے باوجود کہ بانی پاکستان انتہائی کمزور ہو چکے تھے اور ان کا جسم کمبل میں لپٹا ہوا تھا، انہوں نے اپنا ہاتھ باہر نکالتے ہوئے مجھ سے نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پوچھا ''آپ کو راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟'' مرض الموت میں مبتلا اس عظیم انسان کے اخلاق، تواضع اور انکساری کی یہ اچھوتی مثال تھی، حالانکہ مجھ سے ہاتھ ملانے اور مزاج پُرسی کرنے ہی سے وہ ہانپنے لگے اور بعد میں کئی منٹ تک آنکھیں بند کئے لیٹے رہے۔

برصغیر کے مسلمانوں کو ایک آزاد وطن سے روشناس کرانے والے قائداعظم کا خدا پر ایمان اور اصولوں پر یقین ہمارے لئے خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔ قائداعظم بظاہر ان معنوں میں مذہبی رہنما نہ تھے جن معنوں میں عام طور پر ہم مذہبی رہنماؤں کو لیتے ہیں، لیکن مذہب پر ان کا یقین کامل تھا۔ ایک بار دوا کے اثرات دیکھنے کیلئے ہم ان کے پاس بیٹھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں، لیکن ہم نے بات چیت سے منع کر رکھا تھا، اس لئے الفاظ لبوں پر آ کر رک جاتے ہیں۔ اس ذہنی کشمکش سے نجات دلانے کیلئے ہم نے خود انہیں دعوت دی تو وہ بولے:

''تم جانتے ہو، جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن چکا ہے تو میری روح کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے! یہ مشکل کام تھا اور میں اکیلا اسے کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرا ایمان ہے کہ یہ رسولِ خدا ﷺ کا روحانی فیض ہے کہ پاکستان وجود میں آیا۔ اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں، تاکہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے۔

پاکستان میں سب کچھ ہے۔ اس کی پہاڑیوں، ریگستانوں اور میدانوں میں نباتات بھی ہیں اور معدنیات بھی۔ انہیں تسخیر کرنا پاکستانی قوم کا فرض ہے۔ قومیں نیک نیتی، دیانت داری، اچھے اعمال اور نظم وضبط سے بنتی ہیں اور اخلاقی برائیوں، منافقت، زر پرستی اور خود پسندی سے تباہ ہو جاتی ہیں''۔

N.A. BILL NO. 18 OF 2005

A Bill further to amend the constitution of Islamic Republic of Pakistan.

Whereas Islam has been declared to be the State Religion of Pakistan and it is obligatory for all Muslims to regulate and order their lives in accordance with the injunctions of the Holy Qur'an and Sunnah.
And Whereas in order to achieve the aforesaid objective and goal, it is expedient further to amend the Constitution of Islamic Republic of Pakistan, 1973 (hereinafter referred to as the Constitution). Now therefore, it is hereby enacted as following:

1. **Short Title and Commencement:-**
   (1) This act may be called the Constitution (Eighteenth Amendment) Act, 2005.
   (2) It shall come into force at once.
2. Addition of the following words in Article 2-A :- It will take precedence over all the provisions of the CONSTITUTION.
3. Addition of New Article 2B in the Constitution:- After Article 2A, the following new Article 2B shall be added in the Constitution, namely:
   "2(B) (1) All existing laws shall be brought in conformity with the injunctions of Islam as laid down in the Holy Qur'an and Sunnah and no Law shall be enacted which is repugnant to such injunctions.
   (2) Nothing contained in any Article of the Constitution shall affect the personal law, religious freedom and customs of non-Muslims.
   (3) The provisions of this Article shall have effect and shall be operative and self executory."
4. **Article 227 of the Constitution with Explanation and clauses (2) and (3) shall be omitted.**
5. **Amendment of Article 203-B:-** In the Constitution in clause "C" of the Article 203- B. after the words "force of law" all the words up to the last word "and" shall be substituted by the following, namely:-
   "shall include the Constitution, Muslim personal law and also any law relating to the procedure of any court or tribunal and any fiscal law or any law relating to the levy and collection of taxes and fee or banking insurance practice and procedure."
6. **Amendment of Article 303-C:-** In the Constitution after clause (3A) of Article 203- C, the following clause (3B) shall be added, namely:-
   "(3B) The Ulema judges shall be entitled to the same remuneration, allowances pension and privileges as are admissible to a permanent judge of a High Court."
7. **Amendments of Article 203-F:-**
   Amendment No. 1:- In the Constitution, in Article 203-F, sub-clause (b) of clause (3) shall be substituted by the following, namely:-
   "Two Ulema shall be appointed by the President as permanent Judges of the Supreme Court from amongst the Ulema judges of the Federal Shariah Court or from out of panel of Ulema to be drawn up by the President in consultation with the Chief Justice. The Ulema judges shall be entitled to the same remuneration, allowances pension and privileges as are admissible to a judge of the Supreme Court."
   Amendment No. 2:- In the Constitution, in Article 203-F sub-clause (4) and sub-clause (6) shall be omitted.
8. In the Constitution Article 230 and Article 231 shall be omitted.

پاکستان کی نظریاتی اساس کو مستحکم کرنے کا واحد طریقہ

یہ ہے کہ اس حقیقت کا ادراک واعتراف کرلیا جائے کہ پاکستان کی بقا اور استحکام اور ملک میں قومی یکجہتی کی بحالی
دوسرے تمام عوامل سے بڑھ کر اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام اور شریعتِ اسلامی کے نفاذ پر منحصر ہے

اور بحمد للہ دستورِ پاکستان میں اس کی بنیاد بھی پڑ چکی ہے!

تاہم دستور کی اسلامی دفعات کے پوری طرح مؤثر ہونے کی راہ میں چند چور دروازے حائل ہیں
جن کی بنا پر ہمارا دستور ''منافقت کا پلندہ'' بن کر رہ گیا ہے، چنانچہ

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ دستور میں ترمیم کے ذریعے

۱) قراردادِ مقاصد (دفعہ۲۔الف) کو پورے دستور پر حاوی قرار دیا جائے!
۲) دفعہ۲۲۷ کو دفعہ۲۔ب کی حیثیت سے قراردادِ مقاصد سے ملحق کر دیا جائے اور اسلامی نظریاتی کونسل کو ختم کر دیا جائے!
۳) البتہ فیڈرل شریعت کورٹ کو زیادہ مستحکم کیا جائے اور اس کے لئے: (i) اس کے دائرہ کار پر عائد جملہ تحدیدات کو ختم کر دیا جائے! (ii) اس کے کئی بنچ تشکیل دیئے جائیں! (iii) اس کے جج صاحبان کی شرائط ملازمت اور مراعات ہائی کورٹ کے ججوں کے مساوی کی جائیں!

تاکہ اسلامی نظام کے قیام اور شریعت کے نفاذ کا عمل ہموار اور تدریجی طور پر آگے بڑھ سکے

واضح رہے کہ اس وقت پاکستان کے وجود کو جو داخلی اور خارجی خطرات وخدشات لاحق ہیں ان کے لئے ہمیں اللہ کی مدد کی شدید ضرورت ہے۔
اور ان شاء اللہ العزیز پاکستان کے عوام کی انفرادی ''توبہ'' کے ساتھ ساتھ جس کے لئے تحریک خلافت پاکستان اور تنظیم اسلامی کوشاں ہیں

اس دستوری اور آئینی ''توبہ''

اور مسئلہ کشمیر کے منصفانہ حل کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت لازماً ہمارے شامل حال ہو جائے گی۔ اور بھارت کے ساتھ تعلقات کی بحالی اور دوستی اور محبت کی پینگیں بڑھانے سے پاکستان کے وجود کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ اس امر کی urgency کے پیش نظر اس مقصد کے لئے ایک دستوری ترمیم کا بل بھی پیش خدمت ہے تاکہ پاکستان کے قانون ساز اداروں میں شامل کوئی جماعت یا کوئی دردمند فرد اسے لے کر کھڑا ہو جائے اور بقیہ سب لوگوں کو اللہ اس کی تائید کی توفیق عطا فرما دے اور اس طرح ملت اسلامیہ پاکستان پر سے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے مانند عذابِ الٰہی کے بادل چھٹ جائیں!